

تفسير القرآن

النساء

(٣)

النساء

زمانہ نزول اور اجزاء مضمون | یہ سورہ متعدد خطبوں پر مشتمل ہے جو غالباً سلسلہ ہجری کے اواخر سے لے کر سلسلہ ہجری کے اواخر یا سلسلہ ہجری کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ کس مقام سے کس مقام تک کی آیات ایک سلسلہ تقریر میں نازل ہوئی تھیں اور ان کا ٹھیک زمانہ نزول کیا ہے، لیکن بعض احکام اور واقعات کی طرف بعض اشارے ایسے ہیں جن کے نزول کی تاریخیں ہمیں روایات سے معلوم ہو جاتی ہیں اس لیے ان کی مدد سے ہم ان مختلف تقریروں کی ایک سرسری سی حد بندی کر سکتے ہیں جن میں یہ احکام اور یہ اشارے واقع ہوئے ہیں۔

مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ وراثت کی تقسیم اور یتیموں کے حقوق کے متعلق ہدایات جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی تھیں جب کہ مسلمانوں کے مترادفی شہید ہو گئے تھے اور مدینہ کی چھوٹی سی بستی میں اس حادثے کی وجہ سے بہت سے گھروں میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ شہداء کی میراث کس طرح تقسیم کی جائے اور جو یتیم بچے انہوں نے چھوڑے ہیں ان کے مفاد کا تحفظ کیسے ہو۔ اس بنا پر ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ ابتدائی چار رکوع اور پانچویں رکوع کی پہلی تین آیتیں اسی زمانہ میں نازل ہوئی ہوگی۔ روایات میں صلوٰۃ خوف (میں حالت جنگ میں نماز پڑھنے) کا ذکر میں غزوہ ذات الرقاع میں ملتا ہے جو سلسلہ ہجری میں ہوا۔ اس لیے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اسی کے لگ بھگ زمانہ میں وہ خطبہ نازل ہوا ہوگا جس میں اس نماز کی ترکیب بیان کی گئی ہے (رکوع ۱۵)۔

مدینہ سے بنی نضیر کا طُرح ربيع الاول سلسلہ ہجری میں ہوا اس لیے غالب گمان یہ ہے کہ وہ خطبہ اس سے پہلے قریبی زمانہ ہی میں نازل ہوا ہوگا جس میں یہودیوں کو آخری تنبیہ کی گئی ہے کہ ”ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم پھر سے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں۔“

پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمم کی اجازت غزوہ بنی النضیر کے موقع پر دی گئی تھی جو سلسلہ ہجری میں ہوا اس لیے وہ خطبہ جس میں تیمم کا ذکر ہے اسی سے متصل عہد کا سمجھنا چاہیے (رکوع ۶)۔

شبان نزول اور مباحث | اس طرح بحیثیت مجموعی سورہ کا زمانہ نزول معلوم ہو جانے کے بعد ہمیں اس زمانہ کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لینا چاہیے تاکہ سورہ کے مضامین سمجھنے میں اس سے مدد

لی جا سکے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اُس وقت جو کام تھا اُسے تین بڑے بڑے شعبوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک اُس نئی منظم اسلامی سوسائٹی کا نشوونما جس کی بنا ہجرت کے ساتھ ہی مدینہ طیبہ اور اس کے اطراف و جوانب میں پڑ چکی تھی اور دوسری میں جاہلیت کے پُرانے طریقوں کو مٹا کر اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت اور تہذیب و مملکت کے نئے اصول رائج کیے جا رہے تھے۔ دوسرے اُس کشمکش کا مقابلہ جو مشرکین عرب، یہودی قبائل اور منافقین کی مخالفت اصلاح طاقتوں کے ساتھ پوری شدت سے جاری تھی۔ تیسرے اسلام کی دعوت کو ان مزاحم طاقتوں کے علی الرغم پھیلانا اور مزید دلوں اور دماغوں کو مستحضر کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس موقع پر جتنے خطبے نازل کیے گئے وہ سب انہی تین شعبوں سے متعلق ہیں۔

اسلامی سوسائٹی کی تنظیم کے لیے سورہ بقرہ میں جو ہدایات دی گئی تھیں، اب یہ سوسائٹی ان سے زائد ہدایات کی طالب تھی اس لیے سورہ نساء کے ان خطبوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بتایا گیا کہ مسلمان اپنی اجتماعی زندگی کو اسلام کے طریقی پر کس طرح درست کریں۔ خاندان کی تنظیم کے اصول بتائے گئے۔ نکاح پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ معاشرت میں عورت اور مرد کے تعلقات کی حد بندی کی گئی۔ یتیموں کے حقوق معین کیے گئے۔ وراثت کی تقسیم کا ضابطہ مقرر کیا گیا۔ معاشی معاملات کی درستی کے متعلق ہدایات دی گئیں۔ خانگی جھگڑوں کی اصلاح کا طریقہ سکھایا گیا۔ تعزیری قانون کی بنا ڈالی گئی۔ شراب نوشی پر پابندی عائد کی گئی۔ طہارت و پاکیزگی کے احکام دیے گئے۔ مسلمانوں کو بتایا گیا کہ ایک صالح انسان کا طرز عمل خدا اور بندوں کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کے اندر جماعتی نظم و ضبط (ڈسپلن) قائم کرنے کے متعلق ہدایات دی گئیں۔ اہل کتاب کے اخلاقی و مذہبی رویہ پر تبصرہ کر کے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا کہ اپنی ان پیش رفتوں کے نقش قدم پر چلنے سے پرہیز کریں۔ منافقین کے طرز عمل پر تنقید کر کے سچی ایمان داری کے تعینات واضح کیے گئے۔ اور ایمان و نفاق کے امتیازی اوصاف کو بالکل نمایاں کر کے رکھ دیا گیا۔

مخالفت اصلاح طاقتوں سے جو کشمکش برپا تھی اُس نے جنگ اُحد کے بعد زیادہ نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ اُحد کی شکست نے اطراف و دواخ کے مشرک قبائل، یہودی جمالیوں اور گھر کے منافقوں کی ہمتیں بہت بڑھا دی تھیں اور مسلمان ہر طرف سے خطرات میں گھر گئے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ایک طرف پُر جو ش خطبوں کے ذریعہ سے مسلمانوں کو مقابلہ کے لیے ابھارا اور دوسری طرف جنگی حالات میں کام کرنے کے لیے انہیں مختلف ضروری ہدایات دیں۔ مدینہ میں منافق اور ضعیف الایمان لوگ ہر قسم کی خوفناک خبریں اُڑا کر بدحواسی پھیلانے کی کوشش کر رہے

تھے۔ حکم دیا گیا کہ ہر ایسی خبر زمرہ دار لوگوں تک پہنچائی جائے اور جب تک وہ کسی خبر کی تحقیق نہ کر لیں اس کی اشاعت کو روکا جائے۔ مسلمانوں کو بار بار غزوات اور سرتیوں میں جانا پڑتا تھا اور اکثر ایسے استوں سے گزرنا ہوتا تھا جہاں پانی فراہم نہ ہو سکتا تھا۔ اجازت دی گئی کہ پانی نہ ملے تو غسل اور وضو دونوں کے بھلے تمیم کر لیا جائے۔ نیز ایسے حالات میں نماز مختصر کرنے کی بھی اجازت دے دی گئی اور جہاں خطرہ سر پر ہو وہاں صلوة خوف ادا کرنے کا طریقہ بتایا گیا۔ عرب کے مختلف علاقوں میں جو مسلمان کافر قبیلوں کے درمیان منتشر تھے اور برباد قات جنگ کی پیٹ میں بھی آجاتے تھے ان کا معاملہ مسلمانوں کے لیے سخت پریشان کن تھا۔ اس مسئلہ میں ایک طرف اسلامی جماعت کو تفصیلی ہدایات دی گئیں اور دوسری طرف ان مسلمانوں کو بھی ہجرت پر ابھارا گیا تاکہ وہ ہر طرف سے صحت کو دار الاسلام میں آجائیں۔

یہودیوں میں سے بنی نعیر کا دویہ خصوصیت کے ساتھ نہایت معاندانہ ہو گیا تھا اور وہ معاہدات کی صریح خلاف ورزی کر کے کھلم کھلا دشمنان اسلام کا ساتھ دے رہے تھے اور خود مدینہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت کے خلاف سازشوں کے جال بچھا رہے تھے۔ ان کی اس روش پر سخت گرفت کی گئی اور انہیں صاف الفاظ میں آخری تنبیہ کر دی گئی۔ اس کے بعد ہی مدینہ سے ان کا اخراج عمل میں آیا۔

مناضین کے مختلف گروہ مختلف طرز عمل رکھتے تھے اور مسلمانوں کے لیے یہ فیصلہ کن شکل تھا کہ کس قسم کے منافقوں سے کیا معاملہ کریں۔ ان سب کو الگ الگ طبقوں میں تقسیم کر کے ہر طبقہ کے منافقوں کے تعلق بتا دیا گیا کہ ان کے ساتھ یہ بتانا ہونا چاہیے۔

غیر جانبدار معاہد قبائل کے ساتھ جو دویہ مسلمانوں کا ہونا چاہیے تھا اس کو بھی واضح کیا گیا۔ سب سے زیادہ اہم چیز یہ تھی کہ مسلمان کا اپنا کیا کرکڑے داغ ہو کیونکہ اس کشمکش میں یہ مٹی بھر جتا اگر جیت سکتی تھی تو اپنے اخلاق فاضلہ ہی کے زور سے جیت سکتی تھی۔ اس لیے مسلمانوں کو بلند ترین اخلاقیات کی تعلیم دی گئی اور جو کردار بھی ان کی جماعت میں ظاہر ہوئی اس پر سخت گرفت کی گئی۔

دعوت و تبلیغ کا پہلو بھی اس سطورہ میں چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ جاہلیت کے مقابلہ میں اسلام جس اخلاقی و تمدنی اصلاح کی طرف دنیا کو تیار بنا رہا تھا اس کی ترویج کرنے کے علاوہ یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکین، تینوں گروہوں کے غلط مذہبی تعزرات اور غلط اخلاق و اعمال پر اس سطورہ میں تنقید کر کے ان کو دین حق کی طرف دعوت دی گئی ہے۔

سُورَةُ النِّسَاءِ مَدَنِيَّةٌ

رُكُوعَاتُهَا ۲۳

آيَاتُهَا ۱۷۶

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ
وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا
اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ۝
وَاتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ ۝

لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا
جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔ اُس خدا سے ڈرو جس کا
واسطہ سے کہ تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات
کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔
یتیموں کے مال اُن کو واپس دو، اچھے مال کو بُرے مال سے نہ بدل لو،

۱۔ چونکہ آگے چل کر انسانوں کے باہمی حقوق بیان کرنے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ خاندانی نظام کی بہتری
و استواری کے لیے ضروری قوانین ارشاد فرمائے جانے والے ہیں اس لیے تمہیں اس طرح اُٹھانی گئی کہ ایک طرف اللہ
سے ڈرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے کی تاکید کی اور دوسری طرف یہ بات ذہن نشین کروائی کہ تمام انسان ایک مصل سے
ہیں اور ایک دوسرے کا خون اور گوشت پوست ہیں۔

”تم کو ایک جان سے پیدا کیا“ یعنی ذریعہ انسانی کی تخلیق ابتداءً ایک فرد سے کی۔ دوسری جگہ قرآن خود اس کی تشریح
کرتا ہے کہ وہ پہلا انسان آدم تھا جس سے دنیا میں نسل انسانی پھیلی۔

”اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا“ اس کی تفصیل کیفیت ہمارے علم میں نہیں ہے۔ عام طور پر حوا کی تفسیر بیان کرتے ہیں
اور جو بائبل میں بھی بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آدم کی پہلی سے حوا کو پیدا کیا گیا (تقریباً اور زیادہ تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ
حضرت حوا کو حضرت آدم علیہ السلام کی دائیں جانب کی تیرھویں پہلی سے پیدا کیا گیا تھا)۔ لیکن کتاب اللہ اس بارے میں خاموش ہے۔ اور
جو حدیث اس کی تائید میں پیش کی جاتی ہے اس کا مفہوم وہ نہیں ہے جو لوگوں نے سمجھا ہے۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ بات کو اسی طرح چھل رہنے دیا

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ إِنَّكَ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا ۝
وَأِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ
مِّنَ النِّسَاءِ مِمَّا مِثْلُ وَثْلِكَ وَرُبْعٌ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا

اور اُن کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ، یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں اُن میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ اُن کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو ہائے جس طرح اللہ نے اسے عمل رکھا ہے اور اس کی تفصیل کیفیت تحقیق کرنے میں وقت نہ ضائع کیا جائے۔

۲ یعنی جب تک وہ بچے ہیں اُن کے مال انہی کے مفاد پر خرچ کرو اور جب بڑے ہو جائیں تو جو ان کا حق ہے وہ انہیں واپس کر دو۔

۳ جامع فقرہ ہے جس کا ایک مطلب یہ ہے کہ ملال کی کمائی کے بجائے حرام خوری نہ کرنے لگو، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یتیموں کے اچھے مال کو اپنے بُرے مال سے نہ بدل دو۔

۴ اس کے تین مضمون اہل تفسیر نے بیان کیے ہیں:

(۱) حضرت عائشہ اس کی تفسیر میں فرماتی ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جو یتیم بچیاں لوگوں کی سرپرستی میں ہوتی تھیں اُن کے مال اور اُن کے حسن و جمال کی وجہ سے، یا اس خیال سے کہ ان کا کوئی سر دھرتا ہے نہیں جس طرح ہم چاہیں گے دبا کر رکھیں گے، وہ ان کے ساتھ خود نکاح کر لیتے تھے اور پھر اُن پر ظلم کیا کرتے تھے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو دوسری عورتیں دنیا میں موجود ہیں، ان میں سے جو تمہیں پسند آئیں اُن کے ساتھ نکاح کر لو۔ اسی سورۃ میں انیسویں رکوع کی پہلی آیت اس تفسیر کی تائید کرتی ہے۔

(۲) ابن عباس اور ان کے شاگرد و مکرّمہ اس کی تفسیر یہ بیان کرتے ہیں کہ جاہلیت میں نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک شخص دس دس بیویاں کر لیتا تھا۔ اور جب اس کثرت ازدواج سے مصارف بڑھ جاتے تھے تو مجبور ہو کر اپنے یتیم بھائیوں، بھانجروں اور دوسرے بے بس عزیزوں کے حقوق پر دست درازی کرتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نکاح کے لیے چار کی حد مقرر کر دی اور فرمایا کہ ظلم و بے انصافی سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ ایک سے لے کر چار تک اتنی بیویاں کرو جن کے ساتھ تم عدل پر قائم رہ سکو۔

(۳) سعید بن جبیر اور قتادہ اور بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ جہاں تک یتیموں کا معاملہ ہے اہل جاہلیت بھی ان کے ساتھ بے انصافی کرنے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن عورتوں کے معاملہ میں اُن کے ذہن عدل و انصاف کے

فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَلِكَ آدَنَىٰ آلَا تَعْمَلُونَ ۝

پھر ایک ہی بیوی کر ویا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں، بے انصافی سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرین صواب ہے۔

تعمیر سے خالی تھے۔ جتنی چاہتے تھے شادیاں کر لیتے تھے اور پھر ان کے ساتھ ظلم و جور سے پیش آتے تھے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم تینوں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو عورتوں کے ساتھ بھی بے انصافی کرنے سے ڈرو۔ اول تو چار سے زیادہ نکاح ہی نہ کرو، اور اس چار کی حد میں بھی بس اتنی بیویاں رکھو جن کے ساتھ انصاف کر سکو۔

آیت کے الفاظ ان تینوں تفسیروں کے قائل ہیں اور جب نہیں کہ تینوں معہوم مراد ہوں۔ نیز اس کا ایک معہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم تینوں کے ساتھ ویسے انصاف نہیں کر سکتے تو ان عورتوں سے نکاح کرو جن کے ساتھ تم بچتے ہیں۔

۵۵ اس بات پر فقہاء اہل سنت کا اجماع ہے کہ اس آیت کی رو سے تعدد ازواج کو محدود کیا گیا ہے اور بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کو ممنوع کر دیا گیا ہے۔ روایات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ احادیث میں آیا ہے کہ طائف کا رئیس غیلان جب اسلام لایا تو اس کی نو بیویاں تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے حکم دیا کہ چار بیویاں رکھ لے اور باقی کو چھوڑ دے۔ اسی طرح ایک دوسرے شخص (زُفَل بن معاویہ) کی پانچ بیویاں تھیں۔ آپ نے حکم دیا کہ ان میں سے ایک کو چھوڑ دے۔

نیز یہ آیت تعدد ازواج کے ہوا ز کو مدلل کی شرط سے مشروط کرتی ہے۔ جو شخص عدل کی شرط پوری نہیں کرتا مگر ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کے ہوا ز سے فائدہ اٹھاتا ہے وہ اللہ کے ساتھ دغا بازی کرتا ہے۔ حکومت اسلامی کی عدالتوں کو حق حاصل ہے کہ جس بیوی یا جن بیویوں کے ساتھ وہ انصاف نہ کر رہا ہو ان کی دادرسی کریں۔

بعض لوگ اہل مغرب کی سمیت زدہ رائے سے مغلوب و مرعوب ہو کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کا اصل مقصد تعدد ازواج کے طریقے کو (جو مغربی نقطہ نظر سے فی الاصل بُرا طریقہ ہے) مٹا دینا تھا، مگر چونکہ یہ طریقہ بہت زیادہ رواج پا چکا تھا اس لیے اس پر صرف پابندیاں عائد کر کے چھوڑ دیا گیا۔ لیکن اس قسم کی باتیں دراصل محض فہمی غلامی کا نتیجہ ہیں۔ تعدد ازواج کا فی نفسہ ایک بُرائی ہونا بجائے خود ناقابل تسلیم ہے کیونکہ بعض حالات میں یہ چیز ایک تمدنی اور اخلاقی ضرورت بن جاتی ہے۔ اگر اس کی اجازت نہ ہو تو پھر وہ لوگ جو ایک عورت پر قانع نہیں ہو سکتے، حصار نکاح سے باہر صنفی بد امنی پھیلانے لگتے ہیں جس کے نقصانات تمدن و اخلاق کے لیے اس سے بہت زیادہ ہیں جو تعدد ازواج سے پہنچ سکتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے ان لوگوں کو اس کی اجازت دی ہے جو اس کی ضرورت محسوس کریں۔ تاہم جن لوگوں کے نزدیک تعدد ازواج فی نفسہ ایک بُرائی ہے ان کو یہ اختیار تو ضرور حاصل ہے کہ چاہیں تو قرآن کے برخلاف اس کی مذمت کریں اور اسے موقوف کر دینے کا مشورہ دیں۔ لیکن یہ حق انھیں نہیں پہنچتا کہ اپنی رائے کو خواہ مخواہ قرآن

وَاتُوا النِّسَاءَ صِدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً فَإِنْ طِبَّنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا
فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا ۝ وَلَا تَوْنُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالُكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ
لَكُمْ قِيمًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا ۝

اور عورتوں کے مہر خوشدلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو، البتہ اگر وہ خود
اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمہیں معاف کر دیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔
اور اپنے وہ مال جنہیں اللہ نے تمہارے لیے قیام زندگی کا ذریعہ بنایا ہے، نادان لوگوں
کے حوالہ نہ کرو، البتہ انہیں کھانے اور پہنے کے لیے دو اور انہیں نیک ہدایت کرو۔

کی طرف منسوب کریں۔ کیونکہ قرآن نے صریح الفاظ میں اس کو جائز ٹھہرایا ہے اور اشارہ و کنایہ بھی اس کی مذمت میں کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا۔
جس سے معلوم ہو کہ فی الواقع وہ اسے مسدود کرنا چاہتا تھا۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب سنت کی آئینی حیثیت، ص ۷۷ تا ۷۸)
۷ لوندیاں مراد ہیں، یعنی وہ عورتیں جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں اور حکومت کی طرف سے لوگوں میں تقسیم
کر دی جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک آزاد خاندانی بیوی کا بار بھی برداشت نہ کر سکو تو پھر لوندی سے نکاح کر لو، جیسا کہ رکوع
۴ میں آگے آتا ہے۔ یا یہ کہ اگر ایک سے زیادہ عورتوں کی تمہیں ضرورت ہو اور آزاد خاندانی بیویوں کے درمیان عدل رکھنا
تمہارے لیے مشکل ہو تو لوندیوں کی طرف رجوع کرو کیونکہ ان کی وجہ سے تم پر ذمہ داریوں کا بار نسبت کم پڑے گا۔ (آگے
حاشیہ ۴۴ میں لوندیوں کے متعلق احکام کی مزید تفصیل ملے گی)

۸ حضرت عمر اور قاضی شریح کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کو پورا مہر یا اس کا کوئی حصہ
معاف کر دیا ہو اور بعد میں وہ اس کا پھر مطالبہ کرے تو شوہر اس کے ادا کرنے پر مجبور کیا جائے گا، کیونکہ اس کا مطالبہ کرنا
یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اپنی خوشی سے مہر یا اس کا کوئی حصہ چھوڑنا نہیں چاہتی۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حقوق الزین، ج ۱، صفحہ ۱۰۷
۹ یہ آیت وسیع معنی کی حامل ہے۔ اس میں اُمت کو یہ جامع ہدایت فرمائی گئی ہے کہ مال جو ذریعہ قیام زندگی
ہے، ہر حال ایسے نادان لوگوں کے اختیار و تعارف میں نہ رہنا چاہیے جو اسے غلط طریقے سے استعمال کر کے نظام تمدن
و معیشت اور بالآخر نظام اخلاق کو خراب کر دیں۔ حقوق عکیت جو کسی شخص کو اپنے اطاک پر حاصل ہیں اس قدر غیر محدود
نہیں ہیں کہ وہ اگر ان حقوق کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا اہل نہ ہو اور ان کے استعمال سے اجتماعی فساد برپا کر دے
تب بھی اس کے وہ حقوق سلب نہ کیے جاسکیں۔ جہاں تک آدمی کی ضروریات زندگی کا تعلق ہے وہ تو ضرور پوری
ہونی چاہئیں، لیکن جہاں تک حقوق مالکانہ کے آزادانہ استعمال کا تعلق ہے اس پر یہ پابندی عائد ہونی چاہیے کہ یہ

وَابْتَكَوْا إِلَيْكُمْ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ
رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا
وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ

اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم
اُن کے اندر اہلیت پاؤ تو اُن کے مال اُن کے حوالے کر دو۔ ایسا کبھی نہ کرنا کہ حد انصاف سے
تجاوِز کر کے اس خوف سے اُن کے مال جلدی جلدی کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے
حق کا مطالبہ کریں گے۔ یتیم کا جو سرپرست مال دار ہو وہ پرہیزگاری سے کام لے

استعمال اخلاق و تمدن اور اجتماعی معیشت کے لیے صریحاً مقرر نہ ہو۔ اس ہدایت کے مطابق چھوٹے پیت نہ پر
ہر صاحب مال کو اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ اپنا مال جس کے حوالہ کر رہا ہے وہ اس کے استعمال کی صلاحیت
رکھتا ہے یا نہیں۔ اور بڑے پیمانہ پر حکومت اسلامی کو اس امر کا انتظام کرنا چاہیے کہ جو لوگ اپنے اموال پر خود
مالکانہ تصرف کے اہل نہ ہوں، یا جو لوگ اپنی دولت کو بڑے طریقوں سے استعمال کر رہے ہوں، ان کی املاک کو وہ
اپنے انتظام میں لے لے اور ان کی ضروریات زندگی کا بندوبست کر دے۔

۹ یعنی جب وہ سن بلوغ کے قریب پہنچ رہے ہوں تو دیکھتے رہو کہ ان کا عقلی نشوونما کیسا ہے اور ان میں
اپنے معاملات کو خود اپنی ذمہ داری پر چلانے کی صلاحیت کس حد تک پیدا ہو رہی ہے۔

۱۰ مال ان کے حوالہ کرنے کے لیے دو شرطیں عائد کی گئی ہیں: ایک بلوغ، دوسرے رُشد، یعنی مال کے
صحیح استعمال کی اہلیت۔ پہلی شرط کے متعلق تو فقہائے امت میں اتفاق ہے۔ دوسری شرط کے بارے میں امام ابوحنیفہ
رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ اگر سن بلوغ کو پہنچنے پر یتیم میں رُشد نہ پایا جائے تو ولی یتیم کو زیادہ سے زیادہ مدت
سال اور انتظار کرنا چاہیے۔ پھر خواہ رُشد پایا جائے یا نہ پایا جائے، اس کا مال اس کے حوالہ کر دینا چاہیے۔ اور
امام ابو یوسف، امام محمد اور امام شافعی رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ مال حوالہ کیے جانے کے لیے بہر حال رُشد کا
پایا جانا ناگزیر ہے۔ غالباً موقر الذکر حضرات کی رائے کے مطابق یہ بات زیادہ قویں صواب ہوگی کہ اس معاملہ میں
قاضی شریع سے رجوع کیا جائے اور اگر قاضی پر ثبات ہو جائے کہ اس میں رُشد نہیں پایا جاتا تو وہ اس کے معاملات
کی نگرانی کے لیے خود کوئی مناسب انتظام کر دے۔

وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۖ فَإِذَا دَفَعْتُمْ
إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۖ وَكَفَى بِاللَّهِ حَسِيبًا ۝
لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۚ وَلِلنِّسَاءِ
نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا
قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ
أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينُ فَأَرْزُقُوهُمْ مِنْهُ

اور جو غریب ہو وہ معروف طریقہ سے کھائے۔ پھر جب اُن کے مال اُن کے حوالے کرنے لگو
تو لوگوں کو اس پر گواہ بنا لو، اور حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے۔

مردوں کے لیے اُس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو،
اور عورتوں کے لیے بھی اُس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو،
خواہ تھوڑا ہو یا بہت، اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔

اور جب تقسیم کے موقع پر کنبہ کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو

۱۱ یعنی اپنا حق الخدمت اس حد تک لے کہ ہر غیر جانبدار معقول آدمی اس کو مناسب تسلیم کرے۔ نیز یہ کہ
جو کچھ بھی حق الخدمت وہ لے چوری پچھے نہ لے بلکہ علانیہ متعین کر کے لے اور اس کا حساب رکھے۔

۱۲ اس آیت میں واضح طور پر پانچ قانونی حکم دیے گئے ہیں: ایک یہ کہ میراث صرف مردوں ہی کا حصہ نہیں ہے بلکہ عورتیں
بھی اس کی حق دار ہیں۔ دوسرے یہ کہ میراث بہر حال تقسیم ہونی چاہیے خواہ وہ کتنی ہی کم ہو سہی کہ اگر مرنے والے نے ایک گز کپڑا چھوڑا ہے اور
دس وارث ہیں تو اسے بھی کس حصوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ یہ اُرد بات ہے کہ ایک وارث دوسرے وارثوں سے ان کا حصہ خرید لے۔ تیسرے
اس آیت سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ وراثت کا قانون تقسیم کے اموال و املاک پر جاری ہوگا۔ خواہ وہ متقولہ ہوں یا غیر متقولہ، زری ہوں یا منہی
یا کسی اور صنعت مال میں شمار ہوتے ہوں۔ چوتھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میراث کا حق اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب موت کوئی مال چھوڑا ہو یا کچھ
اس سے یہ قاعدہ بھی نکلتا ہے کہ قریب تر رشتہ دار کی موجودگی میں بعید تر رشتہ دار میراث نہ پائے گا۔

وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا ۝ وَلِيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكَوْا
مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَفًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ
وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَى
ظُلْمًا إِنَّهُمْ يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ۝
يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلَّذِ كَرِمِثْلُ حَظِّ الْأُنثَىٰ

اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔

لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشہ لاحق ہوتے۔ پس چاہیے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔ جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کے مال کھاتے ہیں درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھرپوری آگ میں جھونکے جائیں گے۔

تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ:
مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے،

۱۳ خطاب یتیم کے وارثوں سے ہے اور انہیں ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ میراث کی تقسیم کے موقع پر جو دور و نزدیک کے رشتہ دار اور کنبد کے غریب مسکین لوگ اور یتیم بچے آجائیں ان کے ساتھ تنگ نہ رہو۔ میراث میں از روئے شرع ان کا حصہ نہیں ہے تو نہ سہمی، وسعت قلب سے کام لے کر ترکہ میں سے ان کو بھی کچھ نہ کچھ دے دو اور ان کے ساتھ وہ دل شکن باتیں نہ کرو جو ایسے مواقع پر بالعموم چھوٹے دل کے کم ظرف لوگ کیا کرتے ہیں۔

۱۴ حدیث میں آیا ہے کہ جنگ اُحُد کے بعد حضرت سعد بن زید کی بیوی اپنی دو بچیوں کو لیے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انہوں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! یہ سعد کی بچیاں ہیں جو آپ کے ساتھ اُحُد میں شہید ہوئے ہیں۔ ان کے چچا نے پوری جائداد پر قبضہ کر لیا ہے اور ان کے لیے ایک جتہ تک نہیں چھوڑا۔"

فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِنْ كَانَتْ
وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ
مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ
أَبَوَاهُ فَلِلْمُتَّكِئَةِ ثُلُثٌ فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِلْمُتَّكِئَةِ السُّدُسُ

اگر میت کی وارث (دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انہیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے۔

اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے۔

اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ
ملنا چاہیے۔

اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ
دیا جائے۔

اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصہ کی حق دار ہوگی۔

اب بھلا ان بچیوں سے کون نکاح کرے گا؟ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

۱۵ میراث کے معاملہ میں یہ اولین اصولی ہدایت ہے کہ مرد کا حصہ عورت سے دو گنا ہے چونکہ شریعت نے
خاندانی زندگی میں مرد پر زیادہ معاشی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا ہے اور عورت کو بہت سی معاشی ذمہ داریوں کے بارے
میں سبکدوش رکھا ہے، لہذا انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ میراث میں عورت کا حصہ مرد کی بہ نسبت کم رکھا جاتا۔

۱۶ یہی حکم دو لڑکیوں کا بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی لڑکا نہ چھوڑا ہو اور اس کی
اولاد میں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوں تو خواہ دو لڑکیاں ہوں یا دو سے زائد، بہر حال اس کے کل ترکہ کا ۲ حصہ
ان لڑکیوں میں تقسیم ہوگا، اور باقی ۱ حصہ دوسرے وارثوں میں۔ لیکن اگر میت کا صرف ایک لڑکا ہو تو اس پر اجماع ہے
کہ دوسرے وارثوں کی غیر موجودگی میں وہ کل مال کا وارث ہوگا، اور دوسرے وارث موجود ہوں تو ان کا حصہ دینے
کے بعد باقی سب مال اُسے ملے گا۔

۱۷ یعنی میت کے صاحب اولاد ہونے کی صورت میں بہر حال میت کے والدین میں سے ہر ایک ۱/۴ کا

مَنْ بَعْدَ وَصِيَّهِ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنُ آبَائِكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَمَّا دَرُوتُمْ
أَيْتُهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةٌ مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا

یہ سب سہتے اُس وقت نکالے جائیں گے جبکہ وصیت جو میت نے کی ہو پوری کر دی جائے
اور قرض جو اُس پر ہو ادا کر دیا جائے۔

تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون بظاہر نفع تم سے
قریب تر ہے۔ یہ سہتے اللہ نے مقرر کر دیے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سب حقیقتوں سے واقف

حق دار ہوگا خواہ میت کی وارث صرف بیٹیاں ہوں یا صرف بیٹے ہوں، یا بیٹے اور بیٹیاں ہوں، یا ایک بیٹا ہو یا ایک
بیٹی۔ رہے باقی بچے تو ان میں دوسرے وارث شریک ہوں گے۔

۱۷ ماں باپ کے سوا کوئی اور وارث نہ ہو تو باقی بچے باپ کو ملے گا۔ ورنہ بچے میں باپ اور دوسرے
وارث شریک ہوں گے۔

۱۸ بھائی بہن ہونے کی صورت میں ماں کا حصہ بچے کے بجائے چکر دیا گیا ہے۔ اس طرح ماں کے
حصہ میں سے جو بچہ لیا گیا ہے وہ باپ کے حصہ میں ڈالا جائے گا کیونکہ اس صورت میں باپ کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی
ہیں۔ یہ واضح رہے کہ میت کے والدین اگر زندہ ہوں تو اس کے بہن بھائیوں کو حصہ نہیں پہنچتا۔

۱۹ وصیت کا ذکر قرض پر مقدم اس لیے کیا گیا ہے کہ قرض کا ہونا ہر مرنے والے کے حق میں ضروری نہیں ہے
اور وصیت کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ لیکن حکم کے اعتبار سے امت کا اس پر اجماع ہے کہ قرض وصیت پر مقدم
ہے۔ یعنی اگر میت کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے میت کے ترکہ میں سے وہ ادا کیا جائے گا، پھر وصیت پوری کی جائے گی،
اور اس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی۔ وصیت کے متعلق سورہ بقرہ حاشیہ ۱۸۲ میں ہم بتا چکے ہیں کہ آدمی کو اپنے کل مال
کے بچے حصہ کی حد تک وصیت کرنے کا اختیار ہے، اور یہ وصیت کا قاعدہ اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ قانون وراثت کی
رُو سے جن عزیزوں کو میراث میں سے حصہ نہیں پہنچتا ان میں سے جس کو یا جس جس کو آدمی مدد کا مستحق پاتا ہو اس کے لیے
اپنے اختیار قیزی سے حصہ مقرر کر دے۔ مثلاً کوئی یتیم پڑتایا پوتی موجود ہے، یا کسی بیٹے کی بیوہ معیشت کے دن کاٹ
رہی ہے، یا کوئی بھائی یا بہن یا بھادج یا بھتیجا یا بھانجا یا اور کوئی عزیز ایسا ہے جو سہارے کا محتاج نظر آتا ہے تو
اس کے حق میں وصیت کے ذریعہ سے حصہ مقرر کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر رشتہ داروں میں کوئی ایسا نہیں ہے تو دوسرے
مستحقین کے لیے یا کسی رفاہ عام کے کام میں صرف کرنے کے لیے وصیت کی جاسکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کی
کل ملکیت میں سے بچے یا اس سے کچھ زائد کے متعلق شریعت نے میراث کا ضابطہ بنا دیا ہے جس میں سے شریعت کے

حَکِیْمًا ۝ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَکَ اَزْوَاجُکُمْ اِنْ لَمْ یَکُنْ لِهِنَّ
وَلَدٌ فَاِنْ کَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمْ الرُّبْعُ مِمَّا تَرَکْنَ مِنْ
بَعْدِ وَصِیَّتِهِنَّ یُوْصِیْنَ بِهَا اَوْ دِیْنٌ ۚ وَلِهِنَّ الرُّبْعُ مِمَّا تَرَکْتُمْ
اِنْ لَمْ یَکُنْ لَکُمْ وَلَدٌ فَاِنْ کَانَ لَکُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ
مِمَّا تَرَکْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِیَّتِهِنَّ یُوْصُوْنَ بِهَا اَوْ دِیْنٌ ۚ

اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔

اور تمہاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو اس کا آدھا حصہ تمہیں ملے گا اگر وہ بے اولاد
ہوں، ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکہ کا ایک چوتھائی حصہ تمہارا ہے جبکہ وصیت جو
انہوں نے کی ہو پوری کر دی جائے، اور قرض جو انہوں نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے۔
اور وہ تمہارے ترکہ میں سے چوتھائی کی حق دار ہوں گی اگر تم بے اولاد ہو، ورنہ صاحب
اولاد ہونے کی صورت میں ان کا حصہ آٹھواں ہوگا، بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو
وہ پوری کر دی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کر دیا جائے۔

نامزد کردہ وارثوں کو مقررہ حصہ ملے گا۔ اور یہ یا اس سے کچھ کم کو خود اس کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے کہ اپنے مخصوص خاندانی
حالات کے لحاظ سے (جو ظاہر ہے کہ ہر آدمی کے معاملہ میں مختلف ہوں گے) جس طرح مناسب سمجھے تقسیم کرنے کی وصیت
کر دے۔ یہ پھر اگر کوئی شخص اپنی وصیت میں ظلم کرے، یا بالفاظ دیگر اپنے اختیار تیزی کو غلط طور پر اس طرح استعمال کرے
جس سے کسی کے جائز حقوق متاثر ہوتے ہوں تو اس کے لیے یہ چارہ کار رکھ دیا گیا ہے کہ خاندان کے لوگ باہمی رضامندی سے اس کی اصلاح کریں یا
قاضی شرعی سے مداخلت کی درخواست کی جائے اور وہ وصیت کو درست کرے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میرا رسالہ یتیم پوتے کی وراثت۔

۲۱۔ یہ جواب ہے ان سب نادانوں کو جو میراث کے اس خدائی قانون کو نہیں سمجھتے اور اپنی ناقص عقل سے
اس کسر کو پورا کرنا چاہتے ہیں جو ان کے نزدیک اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں رہ گئی ہے۔

۲۲۔ یعنی خواہ ایک بیوی ہو یا کئی بیویاں ہوں، اولاد ہونے کی صورت میں وہ ۱/۴ کی اور اولاد نہ ہونے کی
صورت میں ۱/۸ کی حصہ دار ہوں گی اور یہ ۱/۸ یا ۱/۴ سب بیویوں میں برابری کے ساتھ تقسیم کیا جائے گا۔

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَّةً أَوْ امْرَأَةً وَلَهُ أَخٌ أَوْ
أُخْتُ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ
ذَلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّتِهِ يُوْصَى
بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرِ مُضَارٍّ وَصِيَّتُهُ مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ

اور اگر وہ مرد یا عورت (جس کی میراث تقسیم طلب ہے) بے اولاد بھی ہو اور اس کے
ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں، مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک
کو چھٹا حصہ ملے گا، اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکہ کے ایک تہائی میں وہ سب
شریک ہوں گے، جبکہ وصیت جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے، اور قرض جو میت نے چھوڑا
ہو ادا کر دیا جائے، بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو۔ یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانائو مینا

۲۳ باقی ۴ یا ۵ جو بچتے ہیں ان میں اگر کوئی اور وارث موجود ہو تو اس کو حصہ ملے گا، ورنہ اس پوری
باقی ماندہ ملکیت کے متعلق اس شخص کو وصیت کرنے کا حق ہوگا۔

اس آیت کے متعلق مفسرین کا اجماع ہے کہ اس میں بھائی اور بہنوں سے مراد بیخانی بھائی اور بہن ہیں یعنی
جو میت کے ساتھ صرف ماں کی طرف سے رشتہ رکھتے ہوں اور باپ ان کا دوسرا ہو۔ رہے گئے بھائی بہن اور وہ
سوتیلے بھائی بہن جو باپ کی طرف سے میت کے ساتھ رشتہ رکھتے ہوں، تو ان کا حکم اسی سورتہ کے آخر میں ارشاد ہوا ہے۔

۲۴ وصیت میں ضرر رسائی یہ ہے کہ ایسے طور پر وصیت کی جائے جس سے مستحق رشتہ داروں کے حقوق تلف
ہوتے ہوں۔ اور قرض میں ضرر رسائی یہ ہے کہ محض ہتھلاروں کو محروم کرنے کے لیے آدمی خواہ مخواہ اپنے اوپر ایسے قرض کا
اقرار کرے جو اس نے فی الواقع نہ کیا ہو، یا اور کوئی ایسی چال چلے جس سے مقصود یہ ہو کہ ہتھلار میراث سے محروم ہو جائیں
اس قسم کے ہتھلار کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ وصیت میں نقصان رسائی بڑے گناہوں میں سے ہے۔
اور ایک دوسری حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدمی تمام عمر اہل جنت کے سے کام کرتا رہتا ہے مگر مرتے وقت
وصیت میں ضرر رسائی کر کے اپنی کتاب زندگی کو ایسے عمل پر ختم کر جاتا ہے جو اسے دوزخ کا مستحق بنا دیتا ہے۔ یہ ضرر
اور حق تلفی اگرچہ ہر حال میں گناہ ہے مگر خاص طور پر کلام کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اس لیے فرمایا کہ جس
شخص کے نہ اولاد ہو نہ ماں باپ ہوں اس میں عمر باریہ میلان پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنی جائداد کو کسی نہ کسی طرح تلف کر جائے اور

حَلِيمٌ ۝۱۲ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ
جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَلِكَ
الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝۱۳ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ
حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُهِينٌ ۝۱۴

اور نرم ہوئے۔

یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اُسے
اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغوں میں وہ ہمیشہ
رہے گا اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور
اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائے گا اُسے اللہ آگ میں ڈالے گا جس میں وہ
ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن سزا ہے۔ ۱۲۵

نسبتاً دور کے رشتہ داروں کو حصہ پانے سے محروم کر دے۔

۱۲۵ یہاں اللہ تعالیٰ کی صفت علم کا اظہار دو وجہ سے کیا گیا ہے: ایک یہ کہ اگر اس قانون کی خلاف ورزی
کی گئی تو اللہ کی گرفت سے آدمی نہ بچ سکے گا۔ دوسرے یہ کہ اللہ نے جو حصے جس طرح مقرر کیے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں کیونکہ
بندوں کی مصلحت جس چیز میں ہے اللہ اس کو خود بندوں سے زیادہ بہتر جانتا ہے۔ اور اللہ کی صفت علم یعنی اس کی نرم فونی
کا ذکر اس لیے فرمایا کہ اللہ نے یہ قوانین مقرر کرنے میں سختی نہیں کی ہے بلکہ ایسے قاعدے مقرر کیے ہیں جن میں بندوں
کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولت ہے تاکہ وہ مشقت اور تنگی میں مبتلا نہ ہوں۔

۱۲۵ یہ ایک بڑی خوفناک آیت ہے جس میں اُن لوگوں کو ہمیشگی کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ
کے مقرر کیے ہوئے قانون وراثت کو تبدیل کریں یا اُن دوسری قانونی حدوں کو توڑیں جو خدا نے اپنی کتاب میں واضح طور
پر مقرر کر دی ہیں۔ لیکن سخت افسوس ہے کہ اس حق در سخت وعید کے ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں نے بالکل یہ بیویوں
کی سی جسارت کے ساتھ خدا کے قانون کو بدلا اور اس کی حدوں کو توڑا۔ اس قانون وراثت کے معاملہ میں جو نافرمانیاں
کی گئی ہیں وہ خدا کے خلاف کُلّی بغاوت کی حد تک پہنچتی ہیں۔ کہیں عورتوں کو میراث سے مستقل طور پر محروم کیا گیا کہیں

وَالَّتِي يَأْتِيَنَّ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا
عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَإِنْ شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي
الْبُيُوتِ حَتَّى يَتَوَفَّهِنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ
سَبِيلًا ۝ وَالَّذِينَ يَأْتِيَنَّهَا مِنْكُمْ فَادَّوْهُمَا فَإِنْ تَابَا وَ
أَصْلَحَا فَأَعْرِضُوا عَنْهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ۝

تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں اُن پر اپنے میں سے چار آدمیوں
کی گواہی لو، اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں
موت آجائے یا اللہ اُن کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔ اور تم میں سے جو اس فعل کا
ارتکاب کریں اُن دونوں کو تکلیف دو، پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کریں تو انہیں
چھوڑ دو کہ اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

صرف بڑے بیٹے کو میراث کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ کہیں سرے سے تقسیم میراث ہی کے طریقے کو چھوڑ کر "مشترک خاندانی جائداد"
کا طریقہ اختیار کر لیا گیا۔ کہیں عورتوں اور مردوں کا حصہ برابر کر دیا گیا۔ اور اب ان پرانی بغاوتوں کے ساتھ تازہ ترین بغاوت
یہ ہے کہ بعض مسلمان ریاستیں اہل مغرب کی تقلید میں "وفات ڈیوٹی" (Death Duty) اپنے ہاں رائج کر رہی ہیں جس کے
معنی یہ ہیں کہ میت کے وارثوں میں ایک وارث حکومت بھی ہے جس کا حصہ رکھنا اللہ میاں بھول گئے تھے، حالانکہ اسلامی
اصول پر اگر میت کا ترکہ کسی عورت میں حکومت کو پہنچتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کسی مرنے والے کا کوئی قریب و بعید
رشتہ دار موجود نہ ہو اور اس کا چھوڑا ہوا مال تمام اشیاء متروکہ (Unclaimed Properties) کی طرح داخل
بیت المال ہو جائے۔ یا پھر حکومت اس عورت میں کوئی حصہ پاسکتی ہے جبکہ مرنے والا اپنی وصیت میں اس کے لیے
کوئی حصہ مقرر کر جائے۔

۲۶ ان دونوں آیتوں میں زنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔ پہلی آیت صرف زانیہ عورتوں کے متعلق ہے اور
ان کی سزا یہ ارشاد ہوئی ہے کہ انہیں تاحکم ثانی قید رکھا جائے۔ دوسری آیت زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کے بارے
میں ہے کہ دونوں کو اذیت دی جائے، یعنی مارا پیٹا جائے، سخت سست کما جائے اور ان کی تذلیل کی جائے۔ زنا کے

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ
يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ
عَلِيمًا حَكِيمًا ١٤ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ
حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الشَّنَّ

ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہی لوگوں کے لیے ہے جو نادانی کی وجہ
کوئی بُرا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی
نظر عنایت سے پھر متوجہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکم و دانائے
ہے۔ مگر توبہ ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو بُرے کام کیے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ
جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے اُس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی۔

متعلق یہ ابتدائی حکم تھا۔ بعد میں سورہ نور کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں مرد اور عورت دونوں کے لیے ایک ہی حکم دیا گیا
کہ انہیں منکر و مکروں سے لگائے جائیں۔ اہل عرب چونکہ اس وقت تک کسی باقاعدہ حکومت کے ماتحت رہنے اور عدالت
قانون کے نظام کی اطاعت کرنے کے عادی نہ تھے، اس لیے یہ بات حکمت کے خلاف ہوتی اگر اسلامی حکومت قائم
ہوتے ہی ایک قانون تعزیرات بنا کر دفعہ ان پر نافذ کر دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو رفتہ رفتہ تعزیری قوانین کا خوگر
بنانے کے لیے پہلے زنا کے متعلق یہ سزائیں تجویز فرمائیں، پھر بتدریج زنا، قذف اور سرقت کی حدیں مقرر کیں، اور
بالآخر اسی بنا پر تعزیرات کا وہ مفصل قانون بنا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی حکومت میں نافذ تھا۔

مفسر مُبْدِیٰ کہ ان دونوں آیتوں کے ظاہری فرق سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ پہلی آیت منکر و مکروں کے لیے
ہے اور دوسری آیت غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لیے۔ لیکن یہ ایک کمزور تفسیر ہے جس کی تائید میں کوئی دزنی دلیل
نہیں۔ اور اس سے زیادہ کمزور بات وہ ہے جو ابوسلمہ اصفہانی نے لکھی ہے کہ پہلی آیت عورت اور عورت کے ناجائز
تعلق کے بارے میں ہے اور دوسری آیت مرد اور مرد کے ناجائز تعلق کے بارے میں۔ تعجب ہے ابوسلمہ جیسے ذی علم شخص
کی نظر اس حقیقت کی طرف کیوں نہ گئی کہ قرآن انسانی زندگی کے لیے قانون و اخلاق کی شاہراہ بناتا ہے اور انسانی مسائل
سے بحث کرتا ہے جو شاہراہ پر پیش آتے ہیں۔ دیں گیلیاں اور پگڈنڈیاں، تو ان کی طرف توجہ کرنا اور ان پر پیش آنے والے
ضمنی مسائل سے بحث کرنا کام شاہراہ کے لیے ہرگز موزوں نہیں ہے۔ ایسی چیزوں کو اس نے اجتہاد کے لیے چھوڑ دیا

وَالَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارًا أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ
عَذَابًا أَلِيمًا ۝ يٰۤأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا
النِّسَاءَ كَرْهًا وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْنَهُنَّ

اور اسی طرح تو بہ اُن کے لیے بھی نہیں ہے جو مرتے دم تک کافر رہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے
توہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو
اور نہ یہ حلال ہے کہ انہیں تنگ کر کے اُس قہر کا کچھ حصہ اُٹالینے کی کوشش کرو جو تم انہیں دے چکے ہو۔

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد نبوت کے بعد جب یہ سوال پیدا ہوا کہ مرد اور مرد کے ناجائز تعلق پر کیا سزا دی جائے تو صحابہؓ
میں سے کسی نے بھی یہ نہ سمجھا کہ منورہ نساء کی اس آیت میں اس کا حکم موجود ہے۔

۷۲۵ تو بہ کے معنی پلٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ گناہ کے بعد بندے کا خدا سے تو بہ کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ
ایک غلام جو اپنے آقا کا نافرمان بن کر اس سے منہ پھیر گیا تھا اب اپنے کیے پر پشیمان ہے اور اطاعت و فرمان برداری
کی طرف پلٹ آیا ہے۔ اور خدا کی طرف سے بندے پر تو بہ یہ معنی رکھتی ہے کہ غلام کی طرف سے مالک کی نظر عنایت جو
پھر گئی تھی وہ از سر نو اس کی طرف منقطع ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ میرے ہاں معافی صرف اُن بندوں
کے لیے ہے جو قصداً نہیں بلکہ نادانی کی بنا پر قصور کرتے ہیں اور جب آنکھوں پر سے ہماں کا پردہ ہٹتا ہے تو شرمندہ
ہو کر اپنے قصور کی معافی مانگ لیتے ہیں۔ ایسے بندے جب بھی اپنی غلطی پر نادم ہو کر اپنے آقا کی طرف پلٹیں گے اس کا
دروازہ کھلا پائیں گے کہ ۷۲۵

اِس دُرگہ ما در گِز نو میدی نیست

صد بار اگر تو بہ شکستی باز آ

مگر تو بہ اُن کے لیے نہیں ہے جو اپنے خدا سے بے خوف اور بے پروا ہو کر تمام عمر گناہ پر گناہ کیے چلے جائیں
اور پھر عین اُس وقت جبکہ موت کا فرشتہ سامنے کھڑا ہو معافی مانگنے لگیں۔ اسی معنوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان
الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ ان اللہ یقبل توبۃ العبد ما لم یغیر۔ ”اللہ بندے کی توبہ میں اُسی وقت تک قبول کرتا
ہے جب تک کہ آثار موت شروع نہ ہوں“ کیونکہ امتحان کی مُہلت جب پوری ہو گئی اور کتاب زندگی ختم ہو چکی تو اب
پلٹنے کا کونسا موقع ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص کفر کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جائے اور دوسری زندگی کی

إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ
فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ
خَيْرًا كَثِيرًا ۝ وَإِنْ أَرَدْتُمْ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَكَانَ

ہاں اگر وہ کسی صریح بدچلنی کی مرتکب ہوں تو ضرور تمہیں تنگ کرنے کا حق ہے۔ ان کے ساتھ بھلے طریقہ سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ

سرحد میں داخل ہو کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ معاملہ اُس کے برعکس ہے جو وہ دنیا میں سمجھتا رہا تو اس وقت معافی مانگنے کا کوئی موقع نہیں۔

۲۸ اس سے مراد یہ ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد اس کے خاندان والے اس کی بیوہ کو میت کی میراث سمجھ کر اس کے ولی وارث نہ بن بیٹھیں۔ عورت کا شوہر جب مر گیا تو وہ آزاد ہے۔ عدت گزار کر جہاں چاہے جائے اور جس سے چاہے نکاح کر لے۔

۲۹ مال اڑانے کے لیے نہیں بلکہ بدچلنی کی سزا دینے کے لیے۔

۳۰ یعنی اگر عورت خوبصورت نہ ہو یا اس میں کوئی اور ایسا نقص ہو جس کی بنا پر وہ شوہر کو پسند نہ آئے تو یہ مناسب نہیں ہے کہ شوہر فوراً دل برداشتہ ہو کر اسے چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائے۔ حتی الامکان اسے صبر تحمل سے کام لینا چاہیے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت خوبصورت نہیں ہوتی مگر اس میں بعض دوسری خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو ازدواجی زندگی میں شہنشاہت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر اُسے اپنی ان خوبیوں کے اظہار کا موقع ملے تو وہی شوہر جو ابتداءً محض اس کی صورت کی خرابی سے دل برداشتہ ہو رہا تھا، اس کے حسن سیرت پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بسا اوقات ازدواجی زندگی کی ابتداء میں عورت کی بعض باتیں شوہر کو ناگوار محسوس ہوتی ہیں اور وہ اس سے بد دل ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ صبر سے کام لے اور عورت کے تمام امکانات کو بڑے کار آئے کا موقع دے تو اس پر خود ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کی بیوی بڑائیوں سے بڑھ کر خوبیاں رکھتی ہے۔ لہذا یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ آدمی ازدواجی تعلق کو منقطع کرنے میں جلد بازی سے کام لے۔ طلاق بالکل آخری چارہ ہے جس کو ناگزیر حالات ہی میں استعمال کرنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ابغض الحلال الی اللہ الطلاق یعنی طلاق اگرچہ جائز ہے مگر تمام جائز کاموں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند اگر کوئی چیز ہے تو وہ طلاق ہے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ

زَوْجًا وَاتَّيْتُمْ أَحْدَهُنَّ قَطَرًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا
اتَّأْخُذُوا مِنْهُ بُهْتَانًا وَإِنَّمَا مُبِينًا ۝۲۰ وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ
أَفْضَى بَعْضُكُمْ إِلَى بَعْضٍ وَأَخَذَنَ مِنْكُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا ۝۲۱
وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ

ہی کر لو تو خواہ تم نے اُسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔ کیا تم
اُسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے؟ اور آخر تم اُسے کس طرح لے لو گے جب کہ
تم ایک دوسرے سے نطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں؟
اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں اُن سے ہرگز نکاح نہ کرو مگر جو پہلے ہو چکا ہو چکا۔

آپ نے فرمایا تو زوجوا ولا تطلقوا فان الله لا يحب الذواقين والذواقات یعنی نکاح کرو اور طلاق نہ دو کیونکہ اللہ
ایسے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو بھڑے کی طرح پھول پھول کا مزہ چکھتے پھریں۔

۳۱ پختہ عہد سے مراد نکاح ہے کیونکہ وہ حقیقت میں ایک مضبوط پیمانہ وفا ہے جس کے استحکام پر
بھروسہ کر کے ہی ایک عورت اپنے آپ کو ایک مرد کے حوالہ کرتی ہے۔ اب اگر مرد اپنی خواہش سے اس کو توڑتا ہے تو
اُسے وہ معاوضہ واپس لینے کا حق نہیں ہے جو اس نے معاہدہ کرتے وقت پیش کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو سورہ بقرہ
حاشیہ ۲۵۱)۔

۳۲ تمدنی اور معاشرتی مسائل میں جاہلیت کے غلط طریقوں کو حرام قرار دیتے ہوئے بالعموم قرآن مجید
میں یہ بات ضرور فرمائی جاتی ہے کہ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ بے طمی اور نادانی کے زمانہ
میں جو غلطیاں تم لوگ کرتے رہے ہو ان پر گرفت نہیں کی جائے گی بشرطیکہ اب حکم آجائے کے بعد اپنے طرز عمل کی اصلاح
کر لو اور جو غلط کام ہیں انہیں چھوڑ دو۔ دوسرے یہ کہ زمانہ سابق کے کسی طریقے کو اب اگر حرام ٹھہرایا گیا ہے تو اس سے
یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ پچھلے قانون یا رسم و رواج کے مطابق جو کام پہلے کیے جا چکے ہیں ان کو کالعدم اور ان سے
پیدا شدہ نتائج کو ناجائز اور عامد شدہ ذمہ داریوں کو لازماً ساقط بھی کیا جا رہا ہے۔ مثلاً اگر سوتیل ماں سے نکاح کو
آج حرام کیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب تک جتنے لوگوں نے ایسے نکاح کیے تھے ان کی اولاد حرامی قرار
دی جا رہی ہے اور اپنے باپوں کے مال میں ان کا حق وراثت ساقط کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح اگر لین دین کے کسی طریقے کو

إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتًا وَسَاءَ سَبِيلًا ۝ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ
أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ

در حقیقت یہ ایک بے حیائی کا فعل ہے، ناپسندیدہ ہے اور بُرا چلن ہے۔

تم پر حرام کی گئیں تمہاری مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیوں، خالائیں،

حرام کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلے جتنے معاملات اس طریقے پر ہوئے ہیں انہیں بھی کا عدم ٹھہرا دیا گیا ہے اور اب وہ سب دولت جو اس طریقے سے کسی نے کائی ہو اس سے واپس لی جائے گی یا مال حرام ٹھہرائی جائے گی۔
۳۳۳ اسلامی قانون میں یہ فعل فرجہ داری مجرم ہے اور قابل دست اندازی پولیس ہے۔ ابو داؤد، نسائی اور مسند احمد میں یہ روایات ملتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو موت اور ضبطی کا حکم دیا۔ سزا دی ہے۔ اور ابن ماجہ نے ابن عباس سے جو روایت نقل ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت نے یہ قاعدہ فقہیہ ارشاد فرمایا تھا کہ من وقع علی ذات محرم فانتلوه۔ جو شخص عورت میں سے کسی کے ساتھ زنا کرے اُسے قتل کر دو۔ فقہاء کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ امام احمد تو اسی بات کے قائل ہیں کہ ایسے شخص کو قتل کیا جائے اور اس کا مال ضبط کر لیا جائے۔ امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ اگر اس نے عورت میں سے کسی کے ساتھ زنا کیا ہو تو اس پر حد زنا جاری ہوگی، اور اگر نکاح کیا ہو تو اسے سخت جہنم تک سزا دی جائے گی۔
۳۳۴ ماں کا اطلاق سگی اور سوتیلی دونوں قسم کی ماؤں پر ہوتا ہے اس لیے دونوں حرام ہیں۔ نیز اسی حکم میں باپ کی ماں اور ماں کی ماں بھی شامل ہے۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ جس عورت سے باپ کا ناجائز تعلق ہو چکا ہو وہ بھی بیٹے پر حرام ہے یا نہیں۔ سلف میں سے بعض اس کی حرمت کے قائل نہیں ہیں، اور بعض اسے بھی حرام قرار دیتے ہیں، بلکہ ان کے نزدیک جہنم عورت کو باپ نے شہرت سے ہاتھ لگایا ہو وہ بھی بیٹے پر حرام ہے۔ اسی طرح سلف میں اس امر پر بھی اختلاف رہا ہے کہ جس عورت سے بیٹے کا ناجائز تعلق ہو چکا ہو، وہ باپ پر حرام ہے یا نہیں۔ اور جس مرد سے ماں یا بیٹی کا ناجائز تعلق رہا ہو یا بعد میں ہو جائے اس سے نکاح ماں اور بیٹی دونوں کے لیے حرام ہے یا نہیں۔ اس باب میں فقہانہ بحثیں بہت طویل ہیں، مگر یہ بات باطنی تاثر سمجھ میں آ سکتی ہے کہ کسی شخص کے نکاح میں ایسی عورت کا ہونا جس پر اس کا باپ یا اس کا بیٹا بھی نظر رکھتا ہو، یا جس کی ماں یا بیٹی پر بھی اس کی نگاہ ہو، ایک صالح معاشرت کے لیے کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتا۔ شریعت الہی کا مزاج اس معاملہ میں اُن قانونی موثر گائیڈوں کو قبول نہیں کرتا جن کی بنا پر نکاح اور غیر نکاح اور قبل نکاح اور بعد نکاح اور لس اور نظر وغیرہ میں فرق کیا جاتا ہے۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ خاندانی

وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهُنَّ الَّتِي أَرْضَعْنَكُمْ
وَأَخَوَاتُكُم مِّنَ الرِّضَاعَةِ وَأُمَّهُنَّ نِسَائِكُمْ وَرَبَابُكُمْ الَّتِي

بھتیجیاں، بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہو، اور تمہاری
دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری بیویوں کی لڑکیاں جنہوں نے
زندگی میں ایک ہی عورت کے ساتھ باپ اور بیٹے کے یا ایک ہی مرد کے ساتھ ماں اور بیٹی کے شوانی جذبات کا وابستہ
ہونا سخت مفاسد کا موجب ہے اور شریعت اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ
من نظرانی فرہم امرأۃ حرمت علیہا وابنتھا جس شخص نے کسی عورت کے اعضاء صنفی پر نظر ڈالی جو اس کی
ماں اور بیٹی دونوں اس پر حرام ہیں۔ اور لا ینظر لہ فی رجل نظرانی فرہم امرأۃ وابنتھا خدا اس شخص کی عورت
دیکھنا پسند نہیں کرتا جو ایک وقت ماں اور بیٹی دونوں کے اعضاء صنفی پر نظر ڈالے۔ ان روایات سے شریعت
کا مشاہدات واضح ہو جاتا ہے۔

۳۵ بیٹی کے حکم میں پوتی اور نواسی بھی شامل ہیں۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ ناجائز تعلقات
کے نتیجہ میں جو لڑکی ہوئی ہو وہ بھی حرام ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہ، مالک اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے نزدیک
وہ بھی جائز بیٹی کی طرح محرمات میں سے ہے اور امام شافعی کے نزدیک وہ محرمات میں سے نہیں ہے۔ مگر درحقیقت
یہ تصور بھی ذوق سلیم پر بار ہے کہ جس لڑکی کے متعلق آدمی یہ جانتا ہو کہ وہ اسی کے لطف سے پیدا ہوئی ہے اس کے
ساتھ نکاح کرنا اس کے لیے جائز ہو۔

۳۶ سگی بہن اور ماں شریک بہن اور باپ شریک بہن تینوں اس حکم میں یکساں ہیں۔

۳۷ ان سب رشتہوں میں بھی سگے اور سوتیلے کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ باپ اور ماں کی بہن خواہ
سگی ہو خواہ سوتیلی یا باپ شریک بہر حال وہ بیٹے پر حرام ہے۔ اسی طرح بھائی اور بہن خواہ سگی ہوں یا سوتیلی
یا باپ شریک ان کی بیٹیاں ایک شخص کے لیے اپنی بیٹی کی طرح حرام ہیں۔

۳۸ اس امر پر ائمہ میں اتفاق ہے کہ ایک لڑکے یا لڑکی نے جس عورت کا دودھ پیا ہو اس کے لیے وہ
عورت ماں کے حکم میں اور اس کا شوہر باپ کے حکم میں ہے اور تمام وہ رشتے جو حقیقی ماں اور باپ کے تعلق سے
حرام ہوتے ہیں رضاعی ماں اور باپ کے تعلق سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔ اس حکم کا ماخذ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد
ہے کہ یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ حرمت رضاعت کس قدر دودھ
پینے سے ثابت ہوتی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک جتنی مقدار سے روزہ دار کا روزہ ٹوٹ سکتا ہے

فِي حُبُورِكُمْ مِّنْ نِّسَائِكُمُ الَّتِي دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَّمْ يَكُونُوا
دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَالٌ أَبْنَائِكُمُ

تمہاری گودوں میں پرورش پائی ہے۔ اُن بیویوں کی لڑکیاں جن سے تمہارا تعلق زن و شو
ہو چکا ہو۔ ورنہ اگر صرف نکاح ہوا ہو اور تعلق زن و شو نہ ہوا ہو تو (انہیں چھوڑ کر ان کی لڑکیوں
سے نکاح کر لینے میں) تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اور تمہارے اُن بیٹوں کی بیویاں

اتنی ہی مقدار میں اگر بچہ کسی کا دودھ پی لے تو حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔ مگر امام احمد کے نزدیک تین مرتبہ پینے
سے اور امام شافعی کے نزدیک پانچ دفعہ پینے سے یہ حرمت ثابت ہوتی ہے۔ نیز اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ
کس عمر میں پینے سے یہ رشتے حرام ہوتے ہیں۔ اس باب میں فقہاء کے اقوال حسب ذیل ہیں:

(۱) اعتبار صرف اُس زمانہ میں دودھ پینے کا ہے جبکہ بچہ کا دودھ پھڑپھڑا نہ جا چکا ہو اور شیر خوارگی ہی پر
اس کے تغذیہ کا انحصار ہو۔ ورنہ دودھ چھٹائی کے بعد اگر کسی بچے نے کسی عورت کا دودھ پی لیا ہو تو اس کی
حیثیت ایسی ہی ہے جیسے اُس نے پانی پی لیا۔ یہ رائے اُم سلمہ اور ابن عباس کی ہے۔ حضرت علی سے بھی ایک روایت
اس معنی میں آئی ہے۔ زہری، حسن بصری، قتادہ، عکرمہ اور اوزاعی اسی کے قائل ہیں۔

(۲) دو سال کی عمر کے اندر اندر جو دودھ پی لیا ہو صرف اسی سے حرمت رضاعت ثابت ہوگی۔ یہ حضرت
عمر، ابن مسعود، ابو ہریرہ، اور ابن عمر کا قول ہے اور فقہانوں سے امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف، امام محمد
اور سفیان ثوری نے اسے قبول کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ سے بھی ایک قول اسی کی تائید میں منقول ہے۔ امام مالک بھی
اسی حد کے قائل ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ دو سال سے اگر عیدینہ دو عیدینہ زائد عمر بھی ہو تو اس میں دودھ پینے کا وہی حکم ہے۔
(۳) امام ابو حنیفہ اور امام زفر کا مشہور قول یہ ہے کہ زمانہ رضاعت ڈھائی سال ہے اور اس کے اندر پینے
سے حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے۔

(۴) خواہ کسی عمر میں دودھ پیے، حرمت ثابت ہو جائے گی۔ یعنی اس معاملہ میں اصل اعتبار دودھ کا ہے
نہ کہ عمر کا۔ پینے والا اگر بڑھا بھی ہو تو اس کا وہی حکم ہے جو شیر خوار بچے کا ہے۔ یہی رائے ہے حضرت عائشہ کی۔ او
حضرت علی سے بھی صحیح تردایت اسی کی تائید میں منقول ہے۔ اور فقہانوں سے عروہ بن زبیر، عطاء، لیث بن سعد اور
ابن حزم نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

۳۹ اس امر میں اختلاف ہے کہ جس عورت سے محض نکاح ہوا ہو اس کی ماں حرام ہے یا نہیں۔ امام
ابو حنیفہ، مالک، احمد اور شافعی رحمہم اللہ اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ

الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ يَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا
مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ

كُتِبَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ وَاحِلَ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَلِكَ أَنْ تَبْتَغُوا

الحجۃ
(۵)

جو تمہاری صلب سے ہوں۔ اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا ہے کہ ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرو، مگر جو پہلے ہو گیا سو ہو گیا، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں (مُحْصَنَاتُ) البتہ ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو (جنگ میں) تمہارے ہاتھ آئیں۔ یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازم کر دی گئی ہے۔ ان کے ماسوا جتنی عورتیں ہیں انہیں اپنے اموال کے ذریعہ سے حاصل کرنا تمہارے لیے

جب تک کسی عورت سے غلط نہ ہوئی ہو اس کی ماں حرام نہیں ہوتی۔

۴۱۵ ایسی لڑکی کا حرام ہونا اس شرط پر موقوف نہیں ہے کہ اس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو۔ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے محض اس رشتہ کی نزاکت ظاہر کرنے کے لیے استعمال فرمائے ہیں۔ فقہائے اُمت کا اس بات پر تقریباً اجماع ہے کہ سوتیلی بیٹی آدمی پر بہر حال حرام ہے خواہ اس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو یا نہ پائی ہو۔ ۴۱۶ یہ قید اس غرض کے لیے بڑھائی گئی ہے کہ جسے آدمی نے بیٹا بنایا ہو اس کی بیوہ یا مطلقہ آدمی پر حرام نہیں ہے۔ حرام صرف اُس بیٹے کی بیوی ہے جو آدمی کی اپنی صلب سے ہو۔ اور بیٹے ہی کی طرح پوتے اور نواسے کی بیوی بھی دادا اور نانا پر حرام ہے۔

۴۱۷ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولایت ہے کہ خالہ اور بھانجی اور بھوپھی اور بھتیجی کو بھی ایک ساتھ نکاح میں رکھنا حرام ہے۔ اس معاملہ میں یہ اُصول سمجھ لینا چاہیے کہ ایسی دو عورتوں کو جمع کرنا بہر حال حرام ہے جن میں سے کوئی ایک اگر مرد ہوتی تو اس کا نکاح دوسری سے حرام ہوتا۔

۴۱۸ یعنی جاہلیت کے زمانہ میں جو ظلم تم لوگ کرتے رہے ہو کہ دو دو بہنوں سے ایک وقت نکاح کر لیتے تھے اس پر باز پرس نہ ہوگی بشرطیکہ اب اس سے باز رہو (ملاحظہ ہو حاشیہ ۳۲)۔ اسی بنا پر یہ حکم ہے کہ جس شخص نے حالت کفر میں دو بہنوں کو نکاح میں جمع کر رکھا ہو اُسے اسلام لانے کے بعد ایک کو رکھنا اور ایک کو چھوڑنا ہوگا۔

۴۴۔ یعنی جو عورتیں جنگ میں پکڑی ہوئی آئیں اور ان کے کافر شوہر دارالحرب میں موجود ہوں وہ حرام نہیں ہیں کیونکہ دارالحرب سے دارالاسلام میں آنے کے بعد ان کے نکاح ٹوٹ گئے۔ ایسی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی کیا جاسکتا ہے اور جس کی ملک یمن میں وہ ہوں وہ ان سے تمتع بھی کر سکتا ہے۔ البتہ فقہاء کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ اگر میاں اور بیوی دونوں ایک ساتھ گرفتار ہوں تو ان کا کیا حکم ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ ان کا نکاح باقی رہے گا اور امام مالک شافعی کا مسلک یہ ہے کہ ان کا نکاح بھی باقی نہ رہے گا۔

لنڈیوں سے تمتع کے معاملہ میں بہت سی غلط فہمیاں لوگوں کے ذہن میں ہیں، لہذا حسب ذیل مسائل کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے:

(۱) جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوں ان کو پکڑتے ہی ہر سپاہی ان کے ساتھ مباشرت کر لینے کا مجاز نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی قانون یہ ہے کہ ایسی عورتیں حکومت کے حوالہ کر دی جائیں گی۔ حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے ان کو رہا کر دے، چاہے ان سے فدیہ لے، چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں اور چاہے تو انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے۔ ایک سپاہی صرف اُس عورت ہی سے تمتع کرنے کا مجاز ہے جو حکومت کی طرف سے باقاعدہ اس کی ملک میں دی گئی ہو۔

(۲) جو عورت اس طرح کسی کی ملک میں دی جائے اس کے ساتھ بھی اس وقت تک مباشرت نہیں کی جاسکتی جب تک کہ اسے ایک مرتبہ ایام باہراری نہ آجائیں اور یہ طہینان نہ ہو لے کہ وہ حاملہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے مباشرت کرنا حرام ہے۔ اور اگر وہ حاملہ ہو تو وضع محل سے پہلے بھی مباشرت ناجائز ہے۔

(۳) جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتع کے معاملہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اہل کتاب ہی میں سے ہوں۔ ان کا مذہب خواہ کوئی ہو، بہر حال جب وہ تقسیم کر دی جائیں گی تو جن کے حصہ میں وہ آئیں وہ ان سے تمتع کر سکتے ہیں۔

(۴) جو عورت جس شخص کے حصہ میں دی گئی ہو صرف وہی اس کے ساتھ تمتع کر سکتا ہے۔ کسی دوسرے کو اسے ہاتھ لگانے کا حق نہیں ہے۔ اس عورت سے جو اولاد ہوگی وہ اسی شخص کی جائز اولاد سمجھی جائے گی جس کی ملک میں وہ عورت ہے۔ اُس اولاد کے قانونی حقوق وہی ہوں گے جو شریعت میں صلیبی اولاد کے لیے مقرر ہیں۔ صاحب اولاد ہوجانے کے بعد وہ عورت فروخت نہ کی جاسکے گی۔ اور مالک کے مرتے ہی وہ آپ سے آپ آزاد ہو جائے گی۔

(۵) جو عورت اس طرح کسی شخص کی ملک میں آئی ہو اسے اگر اس کا مالک کسی دوسرے شخص کے نکاح میں دے تو پھر مالک کو اس سے دوسری تمام خدمات لینے کا حق تو رہتا ہے لیکن شہوانی تعلق کا حق باقی نہیں رہتا۔

(۶) جس طرح شریعت نے بیویوں کی تعداد پر چار کی پابندی لگائی ہے اُس طرح لنڈیوں کی تعداد پر نہیں لگائی۔ لیکن اس معاملہ میں کوئی حد مقرر نہ کرنے سے شریعت کا منشا یہ نہیں تھا کہ مالدار لوگ بے شمار لنڈیاں خرید کر جمع کر لیں اور اپنے گھر کو عیاشی کا گھر بنالیں۔ بلکہ درحقیقت اس معاملہ میں عدم تعین کی وجہ جنگی حالات کا عدم تعین ہے۔

(۷) ملکیت کے تمام دوسرے حقوق کی طرح وہ مالکانہ حقوق بھی قابل انتقال ہیں جو کسی شخص کو اڑھوئے قانون

بِأَمْرِ الْكُمُ الْمُحْصِنِينَ غَيْرِ مُسَفِّحِينَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ
فَأْتُوهُنَّ أَجُورَهُنَّ فَرِيضَةً ۖ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرْضَيْتُمْ مِنْ
بَعْدِ الْفَرِيضَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ
طَوْلًا أَنْ يَنْكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ
مِنْ فَتْيَتِكُمْ الْمُؤْمِنَاتِ ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ

حلال کر دیا گیا ہے، بشرطیکہ حصار نکاح میں اُن کو محفوظ کرو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو۔
پھر جو ازدواجی زندگی کا نطفہ تم ان سے اٹھاؤ اس کے بدلے اُن کے مہر بطور فرض کے
ادا کرو، البتہ مہر کی قرارداد ہو جانے کے بعد آپس کی رضامندی سے تمہارے درمیان اگر
کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اللہ علیم اور دانائے ہے۔ اور جو شخص تم میں سے
اتنی قدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں (محصنات) سے نکاح کر سکے اسے چاہیے
کہ تمہاری اُن لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کر لے جو تمہارے قبضہ میں ہوں اور مومنہ
ہوں۔ اللہ تمہارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے، تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو،
کسی اسیر جنگ پر حکومت نے عطا کیے ہوں۔

(۸) حکومت کی طرف سے حقوق ملکیت کا باقاعدہ عطا کیا جانا ویسا ہی ایک قانونی فعل ہے جیسا نکاح ایک
قانونی فعل ہے۔ لہذا کوئی معقول وجہ نہیں کہ جو شخص نکاح میں کسی قسم کی کراہت محسوس نہیں کرتا وہ خواہ لوندی سے
تشیع میں کراہت محسوس کرے۔

(۹) اسیران جنگ میں سے کسی عورت کو کسی شخص کی ملکیت میں دے دینے کے بعد پھر حکومت اسے واپس لینے کی مجاز
نہیں رہتی۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی عورت کا ولی اس کو کسی کے نکاح میں دے چکنے کے بعد پھر واپس لینے کا حق دار نہیں رہتا۔
(۱۰) اگر کوئی فوجی کمانڈر محض وقتی اور عارضی طور پر اپنے سپاہیوں کو قیدی عورتوں سے شہوانی پیاس بجھا لینے کی اہانت دیکھے
اور محض کچھ وقت کے لیے انہیں فوج میں تقسیم کرے تو یہ اسلامی قانون کی نڈ سے قطعاً ایک ناجائز فعل ہے۔ اس میں اور مذاہم کوئی فرق نہیں ہے
اور مذاہم اسلامی قانون میں مجرم ہے۔ تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو جہاں کتاب تفسیرات "حصہ دوم" اور رسائل و رسائل "حصہ اول"۔

فَاَنْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاتُوْهُنَّ اَجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ
مُحْصَنَاتٍ غَيْرِ مُسَفِّحَاتٍ وَلَا مُتَّخِذَاتِ اَخْدَانٍ فَاِذَا اُحْصِنَ
فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ
مِنَ الْعَذَابِ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ط وَاَنْ

لہذا اُن کے سرپرستوں کی اجازت سے اُن کے ساتھ نکاح کرو اور معروف طریقہ سے
اُن کے مہرا د کر دو، تاکہ وہ حصارِ نکاح میں محفوظ (محصنات) ہو کر رہیں، آزاد شہوت رانی
کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں۔ پھر جب وہ حصارِ نکاح میں محفوظ ہو جائیں
اور اس کے بعد کسی بدچلنی کی ترنگب ہوں تو ان پر اُس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے جو خاندانی
عورتوں (محصنات) کے لیے مقرر تھی۔ یہ سہولت تم میں سے اُن لوگوں کے لیے پیدا کی گئی
ہے جن کو شادی نہ کرنے سے بند تقویٰ کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ لیکن اگر

۴۳۵ یعنی معاشرت میں لوگوں کے درمیان جو فرق مراتب ہے وہ محض ایک اعتباری چیز ہے، اور نہ دراصل
سب مسلمان یکساں ہیں اور اگر کوئی حقیقی دیگر امتیاز ان کے درمیان ہے تو وہ ایمان ہے جو محض اُونچے گھرانوں ہی کا حصہ
نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک لونڈی ایمان و اخلاق میں ایک خاندانی عورت سے بہتر ہو۔

۴۳۶ سرسری نگاہ میں یہاں ایک پیمپیڈگی واقع ہوتی ہے جس سے خوارج اور اُن دوسرے لوگوں نے فائدہ
اُٹھایا ہے جو رجم کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ”اگر آزاد شادی شدہ عورت کے لیے شریعت اسلام میں زنا کی سزا رجم ہے
تو اس کی نصف سزا کیا ہو سکتی ہے جو لونڈی کو دی جائے؟ لہذا یہ آیت اس بات پر دلیل قاطع ہے کہ اسلام میں رجم کی
سزا ہے ہی نہیں“ لیکن ان لوگوں نے قرآن کے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ اس رکوع میں لفظ مُحْصَنَاتُ (محفوظ عورتیں) دو
مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایک ”شادی شدہ عورتیں“ جن کو شوہر کی حفاظت حاصل ہو۔ دوسرے خاندانی
عورتیں جن کو خاندان کی حفاظت حاصل ہو اگرچہ وہ شادی شدہ نہ ہوں۔ آیت زیر بحث میں ”محصنات“ کا لفظ لونڈی کے
بالمقابل خاندانی عورتوں کے لیے دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے نہ کہ پہلے معنی میں، جیسا کہ آیت کے مضمون سے صاف
ظاہر ہے۔ بخلاف اس کے لونڈیوں کے لیے محصنات کا لفظ پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے اور صاف الفاظ میں فرمایا ہے
کہ جب انہیں نکاح کی حفاظت حاصل ہو جائے (فَاِذَا اُحْصِنَ) تب ان کے لیے زنا کے الزام پر وہ سزا ہے جو



تَصْبِرُوا خَيْرٌ لَّكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٥٥﴾ يُرِيدُ اللَّهُ
لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ
يَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٦﴾ وَاللَّهُ يُرِيدُ أَنْ

تم صبر کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اور اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے ۵۵
اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان طریقوں کو واضح کرے اور انہی طریقوں پر تمہیں چلائے جن کی
پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحاء کرتے تھے۔ وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمہاری طرف
متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے، اور وہ علیم بھی ہے اور دانائے بھی۔ ہاں اللہ تو تم پر رحمت کے ساتھ

مذکور ہوئی۔ اب اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ خاندانی عورت کو دو حفاظتیں حاصل
ہوتی ہیں۔ ایک خاندان کی حفاظت جس کی بنا پر وہ شادی کے بغیر بھی محضہ ہوتی ہے۔ دوسری شوہر کی حفاظت جس کی وجہ
اس کے لیے خاندان کی حفاظت پر ایک اور حفاظت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے لونڈی جب تک لونڈی ہے
محضہ نہیں ہے، کیونکہ اس کو کسی خاندان کی حفاظت حاصل نہیں ہے۔ البتہ نکاح ہونے پر اس کو صرف شوہر کی حفاظت
حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی اٹھوڑی، کیونکہ شوہر کی حفاظت میں آنے کے بعد بھی نہ تو وہ ان لوگوں کی بندگی سے آزاد ہوتی ہے
جن کی ملک میں وہ تھی، اور نہ اُسے معاشرت میں وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو خاندانی عورت کو نصیب ہوا کرتا ہے۔ لہذا اسے
جو سزا دی جائے گی وہ غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے آدھی ہوگی نہ کہ شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے۔
یہ سب سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ سورہ نوری کی دوسری آیت میں زنانہ کی جس سزا کا ذکر ہے وہ صرف غیر شادی شدہ خاندانی
عورتوں کے لیے ہے جن کے مقابلہ میں یہاں شادی شدہ لونڈی کی سزا نصف بیان کی گئی ہے۔ رہیں شادی شدہ خاندانی
عورتیں، تو وہ غیر شادی شدہ محضات سے زیادہ سخت سزا کی مستحق ہیں کیونکہ وہ دوہری حفاظت کو توڑتی ہیں۔ اگرچہ سزا ان
ان کے لیے سزا سے رحم کی تصریح نہیں کرتا، لیکن نہایت لطیف طریقہ سے اس کی طرف اشارہ کرتا ہے جو بیلہ الدہن لوگوں کے
معنی رہ جائے تو رہ جائے، نبی کے ذہن رسا سے معنی نہیں رہ سکتا تھا۔

۵۷ یعنی خاندانی عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہو تو کسی لونڈی سے اس کے مالکوں کی اجازت
لے کر نکاح کر لینے کی سہولت۔

۵۸ سورہ کے آغاز سے یہاں تک جو ہدایات دی گئی ہیں اور اس سورہ کے نزول سے پہلے سورہ بقرہ میں
مسائل تمدن و معاشرت کے متعلق جو ہدایات دی جا چکی تھیں، ان سب کی طرف بحیثیت مجموعی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا

يَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَنْ تَمِيلُوا مِيلًا
عَظِيمًا ۝ يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا ۝

تو جتنا چاہتا ہے مگر جو لوگ خود اپنی خواہشات نفس کی پیروی کر رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ
تم راہ راست سے ہٹ کر دُور نکل جاؤ۔ اللہ تم پر سے پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ
انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

جابر ہے کہ یہ معاشرت، اخلاق اور تمدن کے وہ قوانین ہیں جن پر قدیم ترین زمانہ سے ہر دور کے انبیاء اور ائمہ کے صالح پیرو
عمل کرتے چلے آئے ہیں اور یہ اللہ کی عنایت و مہربانی ہے کہ وہ تم کو جاہلیت کی حالت سے نکال کر صالحین کے طریقہ زندگی
کی طرف تمہاری رہنمائی کر رہا ہے۔

۴۹ یہ اشارہ ہے منافقین اور قدامت پرست جہلاء اور فوجی مدینہ کے یہودیوں کی طرف۔ منافقین اور
قدامت پرستوں کو تو وہ اصلاحات سخت ناگوار تھیں جو تمدن و معاشرت میں صدیوں کے جے اور رپے ہوئے تعصبات اور رسم
رواج کے خلاف کی جا رہی تھیں۔ میراث میں لڑکیوں کا حصہ۔ بیوہ عورت کا کسٹمرال کی بندشوں سے رہائی پانا اور عدت کے
بعد اس کا ہر شخص سے نکاح کے لیے آزاد ہو جانا۔ سوتیلی ماں سے نکاح حرام ہونا۔ دو بہنوں کے ایک ساتھ نکاح میں جمع کیے
جانے کو ناجائز قرار دینا۔ متبنی کو وراثت سے محروم کرنا اور منہ بولے باپ کے لیے متبنی کی بیوہ اور مطلقہ کا حلال ہونا۔ یہ اور
اس طرح کی دوسری اصلاحات میں سے ایک ایک چیز ایسی تھی جس پر بڑے بڑے اور آبائی رسوم کے پرستانہ پیچھے اٹھتے
تھے۔ مدتوں ان احکام پر چہ میگوئیاں ہوتی رہتی تھیں۔ شرارت پسند لوگ ان باتوں کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی
دعوت اصلاح کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے پھرتے تھے۔ مثلاً جو شخص کسی ایسے نکاح سے پیدا ہوا تھا جسے اب اسلامی
شریعت حرام قرار دے رہی تھی اس کو یہ کہہ کہہ کر اشتعال دلایا جاتا تھا کہ لیجیے آج جو نئے احکام وہاں آئے ہیں ان کی
رؤ سے آپ کی ماں اور آپ کے باپ کا تعلق ناجائز ٹھہرا دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ نادان لوگ اُس اصلاح کے کام میں کاوشیں
ڈال رہے تھے جو اُس وقت احکام انہی کے تحت انجام دیا جا رہا تھا۔

دوسری طرف یہودی تھے جنہوں نے صدیوں کی موشگافیوں سے اصل خدائی شریعت پر اپنے خود ساختہ احکام و
قوانین کا ایک بھاری خول پڑھا رکھا تھا۔ بے شمار پابندیاں اور باریکیاں اور سختیاں تھیں جو انہوں نے شریعت میں
بڑھائی تھیں۔ بکثرت حلال چیزیں ایسی تھیں جنہیں وہ حرام کر بیٹھے تھے۔ بہت سے اداہم تھے جن کو انہوں نے قانون خداوندی
میں داخل کر لیا تھا۔ اب یہ بات ان کے علماء اور عوام دونوں کی ذہنیت اور مذاق کے بالکل خلاف تھی کہ وہ اس سیدھی
سادھی شریعت کی قدر پہچان سکتے جو قرآن پیش کر رہا تھا۔ وہ قرآن کے احکام کو من کر کے تاب ہو جاتے تھے۔ ایک

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ
إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے
نہ کھاؤ، لیکن دین ہونا چاہیے آپس کی رضامندی سے۔ اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔

ایک چیز پر سو سو اعتراضات کرتے تھے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ یا تو قرآن ان کے فقہاء کے تمام اجتہادات اور ان کے اسلاف
کے سارے اوہام و غرافات کو شریعت الہی قرار دے، ورنہ یہ ہرگز کتاب الہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یہودیوں کے ہاں
دستور تھا کہ ایام مہواری میں عورت کو بالکل پلید سمجھا جاتا تھا۔ نہ اس کا پکایا ہوا کھانا کھاتے۔ نہ اس کے ہاتھ کا پانی پیتے۔
نہ اس کے ساتھ فرش پر بیٹھتے۔ بلکہ اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھو جانے کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔ ان چند دنوں میں عورت خود اپنے
گھر میں اچھوت بن کر رہ جاتی تھی۔ یہی رواج یہودیوں کے اثر سے مدینہ کے انصار میں بھی چل پڑا تھا۔ جب نبی صلی اللہ
علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا۔ جواب میں وہ آیت آئی جو سورۃ بقرہ رکوع ۲۸ کے آغاز
میں درج ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی رو سے حکم دیا کہ ایام مہواری میں صرف مباشرت ناجائز ہے۔ باقی
تمام تعلقات عورتوں کے ساتھ اسی طرح رکھے جائیں جس طرح دوسرے دنوں میں ہوتے ہیں۔ اس پر یہودیوں میں شرمی لگی۔
وہ کہنے لگے کہ یہ شخص تو قسم کھا کر بیٹھا ہے کہ جو کچھ ہمارے ہاں حرام ہے اسے حلال کر کے رہے گا اور جس چیز کو ہم
ناپاک کہتے ہیں اسے پاک قرار دے گا۔

۵۵ "باطل طریقوں" سے مراد وہ تمام طریقے ہیں جو خلاف حق ہوں اور شرعاً و اخلاقاً ناجائز ہوں "لین دین"
سے مراد یہ ہے کہ آپس میں مفاد و منافع کا تبادلہ ہونا چاہیے جس طرح تجارت اور صنعت و حرفت وغیرہ میں ہوتا ہے کہ ایک
شخص دوسرے شخص کی ضروریات فراہم کرنے کے لیے محنت کرتا ہے اور وہ اس کا معاوضہ دیتا ہے۔ "آپس کی رضامندی"
سے مراد یہ ہے کہ لین دین نہ تو کسی ناجائز دباؤ سے ہو اور نہ فریب و دغا سے۔ رشوت اور رشود میں بظاہر رضامندی ہوتی
ہے مگر فی الواقع وہ رضامندی مجبورانہ ہوتی ہے اور دباؤ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جو سے میں بھی بظاہر رضامندی ہوتی ہے مگر
درحقیقت جو سے میں صحتہ لینے والا ہر شخص اس غلط امید پر رضامند ہوتا ہے کہ جیت اس کی ہوگی۔ ہارنے کے ارادے
سے کوئی بھی راضی نہیں ہوتا۔ جعل اور فریب کے کاروبار میں بھی بظاہر رضامندی ہوتی ہے مگر اس غلط فہمی کی بنا پر ہوتی ہے کہ
اندر جعل و فریب نہیں ہے۔ اگر فریب ثانی کو معلوم ہو کہ تم اس سے جعل یا فریب کر رہے ہو تو وہ ہرگز اس پر راضی نہ ہو۔

۵۶ یہ فقرہ پچھلے فقرے کا تتمہ بھی ہو سکتا ہے اور خود ایک مستقل فقرہ بھی۔ اگر پچھلے فقرے کا تتمہ سمجھا جائے
تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھانا خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔ دنیا میں اس سے نظام تمدن

إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ عُدْوَانًا وَ
ظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا ۖ وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ۝ إِنْ
تَجْتَنِبُوا كِبَارَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلَكُمْ

یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے۔ جو شخص ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا
اُس کو ہم ضرور آگ میں جھونکیں گے اور یہ اللہ کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اگر
تم اُن بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو تمہاری
چھوٹی موٹی بُرائیوں کو ہم تمہارے حساب سے ساقط کر دیں گے اور تم کو عزت

خراب ہوتا ہے اور اس کے بڑے نتائج سے حرام خورد آدمی خود بھی نہیں بچ سکتا۔ اور آخرت میں اس کی بدولت آدمی سخت ہزا
کا مستوجب بن جاتا ہے۔ اور اگر اسے مستقل فقرہ سمجھا جائے تو اس کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ دوسرے
یہ کہ خود کسی نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے الفاظ ایسے جامع استعمال کیے ہیں اور ترتیب کلام ایسی رکھی ہے کہ اس سے یہ تینوں مفہوم
نکلے ہیں اور تینوں حق ہیں۔

۵۲ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارا غیر خواہ ہے، تمہاری بھلائی چاہتا ہے، اور یہ اس کی مہربانی ہی ہے کہ وہ تم کو
ایسے کاموں سے منع کر رہا ہے جن میں تمہاری اپنی بربادی ہے۔

۵۳ یعنی ہم تنگ دل اور تنگ نظر نہیں ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پکڑ کر اپنے بندوں کو سزا دیں۔ اگر تمہارا
ناثر اعمال بڑے جرائم سے خالی ہو تو چھوٹی خطاؤں کو نظر انداز کر دیا جائے گا اور تم پر فرد جرم لگائی ہی نہ جائے گی۔ البتہ اگر
بڑے جرائم کا ارتکاب کر کے آؤ گے تو پھر جو مقدمہ تم پر قائم کیا جائے گا اس میں چھوٹی خطائیں بھی گرفت میں آ جائیں گی۔

یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بڑے گناہ اور چھوٹے گناہ میں اُصولی فرق کیا ہے۔ جہاں تک میں نے قرآن اور سنت
میں خود کیا ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے (واللہ اعلم بالصواب) کہ تین چیزیں ہیں جو کسی فعل کو بُرا گناہ بناتی ہیں:

(۱) کسی کی حق تلفی، خواہ وہ خدا ہو جس کا حق تلفت کیا گیا ہے، یا والدین ہوں، یا دوسرے انسان، یا خود اپنا نفس۔
پھر جس کا حق جتنا زیادہ ہے اسی قدر اس کے حق کو تلفت کرنا زیادہ بُرا گناہ ہے۔ اسی بنا پر گناہ کو ”ظلم“ بھی کہا جاتا ہے اور
اسی بنا پر شرک کو قرآن میں ظلمِ عظیم کہا گیا ہے۔

(۲) اللہ سے بے خوفی اور اس کے مقابلہ میں اسکا دوس کی بنا پر آدمی اللہ کے امر و نہی کی پروا نہ کرے اور نافرمانی
کے ارادے سے قصداً وہ کام کرے جس سے اللہ نے منع کیا ہے اور عداوت کاموں کو نہ کرے جن کا اُس نے حکم دیا ہے۔ یہ

مُدْخَلًا كَرِيمًا ۳۱ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَى
بَعْضٍ ۚ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا
اَكْتَسَبْنَ ۚ وَسْئَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۳۲

کی جگہ داخل کریں گے۔

اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ دیا ہے اس کی
تمنا نہ کرو۔ جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اُس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے
کمایا ہے اس کے مطابق اُن کا حصہ۔ ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دُعا مانگتے رہو، یقیناً
اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

نافرمانی جس قدر زیادہ ڈھٹائی اور جسارت اور ناخدا ترسی کی کیفیت اپنے اندر لیے ہوئے ہوگی اسی قدر گناہ بھی شدید ہوگا
اسی معنی کے لحاظ سے گناہ کے لیے "فسق" اور "معصیت" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

(۳) اُن روابط کو توڑنا اور اُن تعلقات کو بگاڑنا جن کے وصل و استحکام اور درستی پر انسانی زندگی کا امن منحصر ہے
خواہ یہ روابط بندے اور خدا کے درمیان ہوں یا بندے اور بندے کے درمیان۔ پھر جو رابطہ جتنا زیادہ اہم ہے اور جس کے
کٹنے سے امن کو جتنا زیادہ نقصان پہنچتا ہے اور جس کے معاملہ میں ماموریت کی جتنی زیادہ توقع کی جاتی ہے، اسی قدر اس کو
توڑنے اور کاٹنے اور خراب کرنے کا گناہ زیادہ بڑا ہے۔ مثلاً زنا اور اس کے مختلف مدارج پر غور کیجیے۔ یہ فعل فی نفسہ نظام
تقدیر کو خراب کرنے والا ہے اس لیے بجائے خود ایک بڑا گناہ ہے مگر اس کی مختلف صورتیں ایک دوسرے سے گناہ میں
شدید ترین۔ شادی شدہ آدمی کا زنا کرنا بن بیاہے کی بہ نسبت زیادہ سخت گناہ ہے۔ منکوحہ عورت سے زنا کرنا غیر منکوحہ
سے کرنے کی بہ نسبت قبیح تر ہے۔ ہمسایہ کے گھر والوں سے زنا کرنا غیر ہمسایہ سے کرنے کی بہ نسبت زیادہ بڑا ہے۔
عورتات مثلاً بہن یا بیٹی یا ماں سے زنا کرنا غیر عورت سے کرنے کی بہ نسبت اشد ہے۔ مسجد میں زنا کرنا کسی اور جگہ کرنے
سے اشد ہے۔ ان مثالوں میں ایک ہی فعل کی مختلف صورتوں کے درمیان گناہ ہونے کی حیثیت سے مدارج کا فرق انہی
وجوہ سے ہے جو اُدھر پر بیان ہوئے ہیں۔ جہاں ماموریت کی توقع جس قدر زیادہ ہے، جہاں انسانی رابطہ جتنا زیادہ مستحق
احترام ہے، اور جہاں اس رابطہ کو قطع کرنا جس قدر زیادہ موجب فساد ہے، وہاں زنا کا ارتکاب اسی قدر زیادہ شدید گناہ
ہے۔ اسی معنی کے لحاظ سے گناہ کے لیے "فجور" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

۳۲ اس آیت میں ایک بڑی اہم اخلاقی ہدایت دی گئی ہے جسے اگر ملحوظ رکھا جائے تو اجتماعِ زندگی میں

وَلِكُلِّ جَعَلْنَا مَوْلًى مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلَّذِينَ عَقَدَتْ
أَيْمَانُكُمْ فَأَوْهَهُمْ نَصِيْبَهُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ۝

اور ہم نے ہر اُس ترکے کے حق دار مقرر کر دیے ہیں جو والدین اور رشتہ دار چھوڑیں
اب رہے وہ لوگ جن سے تمہارے عہد و پیمان ہوں تو ان کا حصہ انہیں دو، یقیناً اللہ
ہر چیز پر نگراں ہے ۝

انسان کو بڑا امن نصیب ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یکساں نہیں بنایا ہے بلکہ ان کے درمیان بے شمار حیثیتوں
سے فرق رکھے ہیں۔ کوئی خوبصورت ہے اور کوئی بدصورت۔ کوئی خوش آواز ہے اور کوئی بد آواز۔ کوئی طاقت ور ہے
اور کوئی کمزور۔ کوئی مسلم الاعضا ہے اور کوئی پیدائشی طور پر جسمانی نقص لے کر آیا ہے کسی کو جسمانی اور ذہنی قوتوں میں سے
کوئی قوت زیادہ دی ہے اور کسی کو کوئی دوسری قوت۔ کسی کو بہتر حالات میں پیدا کیا ہے اور کسی کو بدتر حالات میں۔ کسی کو
زیادہ ذرائع دیے ہیں اور کسی کو کم۔ اسی فرق و امتیاز پر انسانی تمدن کی ساری گونا گونی قائم ہے اور یہ عین مفصلہ حکمت
ہے۔ جہاں اس فرق کو اس کے فطری حدود سے بڑھا کر انسان اپنے مصنوعی امتیازات کا اس پر اضافہ کرتا ہے ہاں ایک
فحیت کا فساد رونما ہوتا ہے، اور جہاں سرے سے اس فرق ہی کو مٹا دینے کے لیے فطرت سے جنگ کرنے کی کوشش
کی جاتی ہے وہاں ایک دوسری فحیت کا فساد برپا ہوتا ہے۔ آدمی کی یہ ذہنیت کہ جسے کسی حیثیت سے اپنے مقابلہ میں
بڑھا کر دیکھے بے چین ہو جائے، یہی اجتماعی زندگی میں رشک، حسد، رقابت، عداوت، مزاحمت اور کشاکش کی جڑ ہے
اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو فضل اُسے جائز طریقوں سے حاصل نہیں ہوتا اسے پھر وہ ناجائز تدبیروں سے حاصل کرنے پر
اتر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اسی ذہنیت سے بچنے کی ہدایت فرما رہا ہے۔ اس کے ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ جو فضل اس نے
دوسروں کو دیا ہو اس کی تمنا نہ کرو، البتہ اللہ سے فضل کی دعا کرو، وہ جس فضل کو اپنے علم و حکمت سے تمہارے لیے مناسب سمجھے گا
عطا فرما دے گا۔ اور یہ جو فرمایا کہ "مردوں نے جو کچھ کیا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کیا ہے اس کے
مطابق ان کا حصہ"، اس کا مطلب جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں میں سے جس کو جو کچھ اللہ نے دیا ہے
اس کو استعمال کر کے جو جتنی اور جیسی بُرائی یا بھلائی کائے گا اسی کے مطابق یا بالفاظ دیگر اسی کی جنس سے اللہ کے ہاں حصہ
پائے گا۔

۵۵ اہل عرب میں قاعدہ تھا کہ جن لوگوں کے درمیان دوستی اور بھائی چارہ کے عہد و پیمان ہو جاتے تھے وہ
ایک دوسرے کی میراث کے مستدار بن جاتے تھے۔ اسی طرح جسے میثا بنایا جاتا تھا وہ بھی مندرجہ باب کا وارث مستدار بناتا
تھا۔ اس آیت میں جاہلیت کے اس طریقے کو منسوخ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ وراثت تو اسی قاعدہ کے مطابق

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى
بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَإِلَّا فَضَّلَتْ لِكُلِّ
حِفْظٌ لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ وَالَّتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ
فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ

مرد عورتوں پر قوام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے اُن میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت و نگرانی میں اُن کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔ اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ، خواب گاہوں میں اُن سے علیحدہ رہو اور مارو رشتہ داروں میں تقسیم ہونی چاہیے جو ہم نے مقرر کر دیا ہے، البتہ جن لوگوں سے تمہارے عہد و پیمان ہوں اُن کو اپنی زندگی میں تم جو چاہو دے سکتے ہو۔

۵۶ قوام یا قیم اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد یا ادارے یا نظام کے معاملات کو درست حالت میں چلانے اور اس کی حفاظت و نگہبانی کرنے اور اس کی ضروریات میں تیار کرنے کا ذمہ دار ہو۔

۵۷ یہاں فضیلت بمعنی شرف اور کرامت اور عزت نہیں ہے، جیسا کہ ایک عام اردو خواں آدمی اس لفظ کا مطلب لے گا، بلکہ یہاں یہ لفظ اس معنی میں ہے کہ ان میں سے ایک صنف (یعنی مرد) کو اللہ نے طبعاً بعض ایسی خصوصیات اور قوتیں عطا کی ہیں جو دوسری صنف (یعنی عورت) کو نہیں دیں یا اس سے کم دی ہیں۔ اس بنا پر خاندانی نظام میں مرد ہی قوام بننے کی اہلیت رکھتا ہے اور عورت فطرۃً ایسی بنائی گئی ہے کہ اسے خاندانی زندگی میں مرد کی حفاظت و نگرانی کے تحت رہنا چاہیے۔

۵۸ حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اُسے دیکھو تو تمہارا جی خوش ہو جائے، جب تم اسے کسی بات کا حکم دو تو وہ تمہاری اطاعت کرے، اور جب تم گھر میں نہ ہو تو وہ تمہارے پیچھے تمہارا مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔“ یہ حدیث اس آیت کی بہترین تفسیر کرتی ہے۔ مگر یہاں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ عورت پر اپنے شوہر کی اطاعت سے اہم اور اقدم اپنے خالق کی اطاعت ہے۔ لہذا اگر کوئی شوہر خدا کی معصیت کا حکم دے یا خدا کے عائد کیے ہوئے کسی فرض سے باز رکھنے کی کوشش کرے تو اس کی اطاعت سے انکار کر دینا عورت کا فرض ہے۔ اس صورت میں اگر وہ اس کی اطاعت کرے گی تو گناہ گار ہوگی۔ بخلاف اس کے اگر شوہر اپنی بیوی کو نفل نازی یا نفس روزہ ترک کرنے کے لیے کہے تو لازم ہے کہ وہ اس کی اطاعت کرے۔ اس صورت میں اگر وہ نوافل ادا کرے گی تو مقبول نہ ہوں گے۔

فَإِنْ أَطَعْتَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا إِنَّ اللَّهَ كَانَ
عَلِيمًا كَبِيرًا ۝ وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَأَبْعَثُوا
حُكَّامًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحُكَّامًا مِّنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا
يُوفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا ۝

پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لیے بہانے تلاش نہ کرو،
یقین رکھو کہ اُوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالائے تر ہے۔ اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے
تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت
کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو، وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ اُن کے
درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا، اللہ سب کچھ جانتا ہے اور باخبر ہے۔

۵۹ یہ مطلب نہیں ہے کہ تینوں کام بیک وقت کر ڈالے جائیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ شوہر کی حالت میں ان تینوں
تدبیروں کی اجازت ہے۔ اب رہا ان پر عمل درآمد تو بہر حال اس میں قصور اور سزا کے درمیان تناسب ہونا چاہیے اور جہاں
ہلکی تدبیر سے اصلاح ہو سکتی ہو وہاں سخت تدبیر سے کام نہ لینا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیویوں کے مارنے کی جب
کبھی اجازت دی ہے بادل ناخواستہ دی ہے اور پھر بھی اسے ناپسند ہی فرمایا ہے۔ تاہم بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو
پٹے بغیر درست ہی نہیں ہوتیں۔ ایسی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ منہ پر نہ مارا جائے، بے رحمی سے
نہ مارا جائے اور ایسی چیز سے نہ مارا جائے جو جسم پر نشان چھوڑ جائے۔

۶۰ دونوں سے مراد ثالث بھی ہیں اور زوجین بھی۔ ہر جھگڑے میں صلح ہونے کا امکان ہے بشرطیکہ فریقین
بھی صلح پسند ہوں اور بیچ والے بھی چاہتے ہوں کہ فریقین میں کسی طرح صفائی ہو جائے۔

۶۱ اس آیت میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جہاں میاں اور بیوی میں نا موافقت ہو جائے وہاں نزاع سے قطعاً
تکذوب پیچھے یا عدالت میں معاملہ جانے سے پہلے گھر کے گھر ہی میں اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کی تدبیر یہ ہے
کہ میاں اور بیوی میں سے ہر ایک کے خاندان کا ایک ایک آدمی اس غرض کے لیے مقرر کیا جائے کہ دونوں کی کراہت
اختلاف کی تحقیق کر دیں اور پھر آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور تصفیہ کی کوئی صورت نکالیں۔ یہ بیچ یا ثالث مقرر کرنے والا
کون ہو؟ اس سوال کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے تاکہ اگر زوجین خود چاہیں تو اپنے اپنے رشتہ داروں میں سے خود ہی

وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا
وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ
وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا

اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک
برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ، اور پڑوسی
رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایہ سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے، اور اُن لونڈی غلاموں سے جو

ایک ایک آدمی کو اپنے اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے منتخب کریں، ورنہ دونوں خاندانوں کے بڑے بڑے مداخلت
کر کے پہنچ مقرر کریں، اور اگر مقدمہ عدالت میں پہنچ ہی جائے تو عدالت خود کوئی کارروائی کرنے سے پہلے خاندانی پہنچ
مقرر کر کے اصلاح کی کوشش کرے۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ ثالثوں کے اختیارات کیا ہیں۔ فقہاء میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ ثالث فیصلہ
کرنے کا اختیار نہیں رکھتے، البتہ تصفیہ کی جو صورت ان کے نزدیک مناسب ہو اس کے لیے سفارش کر سکتے ہیں، ماننا یا
نہ ماننا زوجین کے اختیار میں ہے۔ ہاں اگر زوجین نے ان کو طلاق یا طلع یا کسی اور امر کا فیصلہ کر دینے کے لیے اپنا وکیل
بنایا ہو تو البتہ ان کا فیصلہ تسلیم کرنا زوجین کے لیے واجب ہوگا۔ یہ حنفی اور شافعی علماء کا مسلک ہے۔ دوسرے گروہ کے
نزدیک دونوں بچوں کو موافقت کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے مگر علیحدگی کا فیصلہ وہ نہیں کر سکتے۔ یہ حسن بصری اور قتادہ اور
بعض دوسرے فقہاء کا قول ہے۔ ایک اور گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ان بچوں کو طلاق اور جدا کر دینے کے پورے
اختیارات ہیں۔ ابن عباس، سعید بن جبیر، ابراہیم حنفی، شعبی، محمد بن بکر، ابن ابی شیبہ، ابن ابی عمیر، ابن ابی حاتم، ابن ابی شیبہ
حضرت عثمان اور حضرت علی کے فیصلوں کی جو نظیریں ہم تک پہنچی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات
پہنچ مقرر کرتے ہوئے عدالت کی طرف سے ان کو مالکانہ اختیارات دے دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عقیل بن ابی طالب اور
ان کی بیوی فاطمہ بنت عقیل بن ربیعہ کا مقدمہ جب حضرت عثمان کی عدالت میں پیش ہوا تو انہوں نے شوہر کے خاندان میں سے
حضرت ابن عباس کو، اور بیوی کے خاندان میں سے حضرت معاویہ بن ابی سفیان کو پہنچ مقرر کیا اور ان سے کہا کہ اگر آپ
دونوں کی رائے میں ان کے درمیان تفریق کر دینا ہی مناسب ہو تو تفریق کر دیں۔ اسی طرح ایک مقدمہ میں حضرت علی
نے حکم مقرر کیا اور ان کو اختیار دیا کہ چاہیں ملا دیں اور چاہیں جدا کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہنچ بطور خود تو عدالتی
اختیارات نہیں رکھتے۔ البتہ اگر عدالت ان کو مقرر کرتے وقت انہیں اختیارات دیدے تو پھر ان کا فیصلہ ایک عدالتی
فیصلے کی طرح نافذ ہوگا۔

مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا
فَخُورًا ۖ ﴿٣٦﴾ الَّذِينَ يَجْعَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ
يَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۖ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ
عَذَابًا مُهِينًا ۖ ﴿٣٧﴾ وَالَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ

تہا کے قبضہ میں ہوں، احسان کا معاملہ رکھو، یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پسند میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔ اور ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں ہیں جو کجی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی کجی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اُسے چھپاتے ہیں۔ ایسے کافر نعمت لوگوں کے لیے ہم نے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنے مال محض لوگوں کو دکھانے کیلئے

۵۶۲ متن میں "الصاحب بالجنب" فرمایا گیا ہے جس سے مراد ہم نشین دوست بھی ہے اور ایسا شخص بھی جس سے کہیں کسی وقت آدمی کا ساتھ ہو جائے۔ مثلاً آپ بازار میں جارہے ہوں اور کوئی شخص آپ کے ساتھ راستہ چل رہا ہو، یا کسی دوکان پر آپ سودا خرید رہے ہوں اور کوئی دوسرا خریدار بھی آپ کے پاس بیٹھا ہو، یا سفر کے دوران میں کوئی شخص آپ کا ہم سفر ہو۔ یہ عارضی ہمسائیگی بھی ہر مذہب اور شریف انسان پر ایک حق عائد کرتی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حتی الامکان اس کے ساتھ نیک برتاؤ کرے اور اسے تکلیف دینے سے مجتنب رہے۔

۱۳۷ اللہ کے فضل کو چھپانا یہ ہے کہ آدمی اس طرح رہے گویا کہ اللہ نے اس پر فضل نہیں کیا ہے۔ مثلاً کسی کو اللہ نے دولت دی ہو اور وہ اپنی حیثیت سے بگڑ کر رہے۔ نہ اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے نہ بندگانِ خدا کی مدد کرے، نہ نیک کاموں میں حصہ لے۔ لوگ دیکھیں تو سمجھیں کہ بیچارہ بڑا ہی غستہ حال ہے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی سخت ناشکری ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ اللہَ اِذَا اَنعَمَ نِعْمَةً عَلٰی عَبْدٍ احَبَّ اَنْ یُّظْهِرَ اَثَرَهَا عَلَیْهِ، اللہ جب کسی بندے کو نعمت دیتا ہے تو وہ پسند کرتا ہے کہ اس نعمت کا اثر بندے پر ظاہر ہو۔ یعنی اس کے کھانے پینے، رہنے سہنے، لباس اور مسکن، اور اس کی داد و دہش، ہر چیز سے اللہ کی دی ہوئی اس نعمت کا اظہار ہوتا رہے۔

النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَنْ يَكُنِ الشَّيْطَانُ لَهُ قَرِينًا فَسَاءَ قَرِينًا ﴿۳۸﴾ وَمَا ذَا عَلَيْهِمْ لَوْ آمَنُوا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَانْفَقُوا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللَّهُ وَكَانَ اللَّهُ بِهِمْ عَلِيمًا ﴿۳۹﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَإِنْ تَكَ حَسَنَةً يَظْعَفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۴۰﴾ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴿۴۱﴾ يَوْمَ يَدْعُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُوا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّى بِهِمُ الْأَرْضُ ۚ

وَقَدْ بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ

خرچ کرتے ہیں اور درحقیقت نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ روزِ آخر پر۔ سچ یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہو اُسے بہت ہی بُری رفاقت میسر آئی۔ آخر ان لوگوں پر کیا آفت آجاتی اگر یہ اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے۔ اگر یہ ایسا کرتے تو اللہ سے ان کی نیکی کا حال اچھا نہ رہ جاتا۔ اللہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اگر کوئی ایک نیکی کرے تو اللہ اُسے دو چند کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔ پھر سوچو کہ اُس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر تمہیں یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔ اُس وقت وہ سب لوگ جنہوں نے رسول کی بات نہ مانی اور اس کی نافرمانی کرتے رہے، تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔

۴۲ یعنی ہر دور کا پیغمبر اپنے دور کے لوگوں پر اللہ کی عدالت میں گواہی دے گا کہ زندگی کا وہ میدانِ حارِ راستہ اور نیکو عمل کا وہ صحیح طریق جس کی تعلیم آپ نے مجھے دی تھی اُسے میں نے ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔ پھر یہی شہادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دور کے لوگوں پر دیں گے، اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا دور آپ کی بعثت کے وقت سے قیامت تک ہے۔ (آل عمران، حاشیہ ۶۹)

وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا ۖ يَأْتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا
الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا
جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا ۗ وَإِنْ كُنْتُمْ

وہاں یہ اپنی کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے ۛ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ نماز اُس وقت پڑھنی چاہیے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔ اور اسی طرح بخوابت کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ غسل نہ کرو، الا یہ کہ راستہ سے گزرتے ہو۔ اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم

۵۶۵ یہ شراب کے متعلق دوسرا حکم ہے۔ پہلا حکم وہ تھا جو سورۃ بقرہ (آیت ۲۱۹) میں گزرا۔ اُس میں صرف یہ ظاہر کر کے چھوڑ دیا گیا تھا کہ شراب بُری چیز ہے، اللہ کو پسند نہیں۔ چنانچہ مسلمانوں میں سے ایک گروہ اس کے بعد ہی شراب سے پرہیز کرنے لگا تھا۔ مگر بہت سے لوگ اسے بدستور استعمال کرتے رہے تھے حتیٰ کہ بسا اوقات نشے کی حالت ہی میں نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے تھے اور کچھ کچھ پڑھ جاتے تھے۔ غالباً سلسلہ ہجری کی ابتدا میں یہ دوسرا حکم آیا اور نشے میں نماز پڑھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے اپنے شراب پینے کے اوقات بدلی دیے اور ایسے اوقات میں شراب پینی چھوڑ دی جن میں یہ اندیشہ ہوتا کہ کہیں نشہ کی حالت میں نماز کا وقت نہ آجائے۔ اس کے کچھ وقت بعد شراب کی قطعی حرمت کا وہ حکم آیا جو سورۃ مائدہ آیت ۹۰-۹۱ میں ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ آیت میں مُسْکِرٌ یعنی نشہ کا لفظ ہے۔ اس لیے یہ حکم صرف شراب کے لیے خاص نہ تھا بلکہ ہر نشہ آور چیز کے لیے عام تھا۔ اور اب بھی اس کا حکم باقی ہے۔ اگرچہ نشہ آور اشیاء کا استعمال بھانٹے خود حرام ہے، لیکن نشہ کی حالت میں نماز پڑھنا اور ہر اعلیٰ تر گناہ ہے۔

۵۶۶ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ جب کسی شخص پر نیند کا غلبہ ہو رہا ہو اور وہ نماز پڑھنے میں بار بار اُونگھ جاتا ہو تو اُسے نماز چھوڑ کر سو جانا چاہیے۔ بعض لوگ اس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ جو شخص نماز کی عربی عبارات کا مطلب نہیں سمجھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔ لیکن علاوہ اس کے کہ یہ ایک بے جا تشدد ہے، خود قرآن کے الفاظ بھی اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ قرآن میں حَتَّىٰ تَفْقَهُوا یا حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ نہیں فرمایا ہے بلکہ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ فرمایا ہے۔ یعنی نماز میں آدمی کو اتنا ہر شس رہنا چاہیے کہ وہ یہ جانے کہ وہ کیا چیز اپنی زبان سے ادا کر رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کھڑا ہو نماز پڑھنے اور شروع کر دے کوئی غفلت۔

مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنْكُم مِّنَ الْغَايَةِ أَوْ لَسْتُمْ
النِّسَاءُ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا
بِوُجُوْهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٢٣﴾

بیمار ہو، یا سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے، یا تم نے عورتوں سے
لمس کیا ہو، اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں
مسح کر لو، بے شک اللہ نرمی سے کام لینے والا اور بخشش فرمانے والا ہے۔

۶۷ جنابت کے اہل معنی دُوری اور بیگانگی کے ہیں۔ اسی سے لفظ اجنبی نکلا ہے۔ اصطلاح شرع میں جنابت سے
مراد وہ نجاست ہے جو قضاء شہوت سے یا خواب میں نادرہ خارج ہونے سے لاحق ہوتی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے آدمی طہارت
سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

۶۸ فقہاء اور مفتیین میں سے ایک گروہ نے اس آیت کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ جنابت کی حالت میں مسجد میں جانا
چاہیے، تاہم کسی کام کے لیے مسجد میں سے گزرنا ہو۔ اسی رائے کو عبد اللہ بن مسعود، انس بن مالک، حسن بصری اور ابراہیم نخعی
وغیرہ حضرات نے اختیار کیا ہے۔ دوسرا گروہ اس سے سفر مراد لیتا ہے۔ یعنی اگر آدمی حالت سفر میں ہو اور جنابت لاحق ہو جائے
تو تیمم کیا جاسکتا ہے۔ رہا مسجد کا معاملہ، تو اس گروہ کی رائے میں غُبنی کے لیے وضو کر کے مسجد میں بیٹھنا جائز ہے۔ یہ رائے حضرت
علی، ابن عباس، سعید بن جبیر اور بعض دوسرے حضرات نے اختیار فرمائی ہے۔ اگرچہ اس امر میں قریب قریب سب کا اتفاق
ہے کہ اگر آدمی حالت سفر میں ہو اور جنابت لاحق ہو جائے اور نہ ٹیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ لیکن پہلا گروہ
اس مسئلہ کو حدیث سے اخذ کرتا ہے اور دوسرا گروہ اس روایت کی بنیاد قرآن کی مندرجہ بالا آیت پر رکھتا ہے۔

۶۹ اس امر میں اختلاف ہے کہ لمس یعنی چھونے سے کیا مراد ہے۔ حضرات علی، ابن عباس، ابو موسیٰ اشعری،
ابن ابی کعب، سعید بن جبیر، حسن بصری اور متعدد ائمہ کی رائے ہے کہ اس سے مراد مباشرت ہے اور اسی رائے کو امام ابو حنیفہ
اور ان کے اصحاب اور امام شافعیان ثوری نے اختیار کیا ہے۔ بخلاف اس کے حضرت عبد اللہ بن مسعود اور عبد اللہ ابن عمر
کی رائے ہے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر ابن خطاب کی بھی یہی رائے ہے کہ اس سے مراد چھونا یا ہاتھ
لگانا ہے اور اسی رائے کو امام شافعی نے اختیار کیا ہے۔ بعض ائمہ نے بیچ کا مسلک بھی اختیار کیا ہے۔ مثلاً امام مالک کی
رائے ہے کہ اگر عورت یا مرد ایک دوسرے کو جذبات شہوانی کے ساتھ ہاتھ لگائیں تو ان کا وضو ماقبل ہو جائے گا اور نماز
کے لیے انہیں نیا وضو کرنا ہوگا، لیکن اگر جذبات شہوانی کے بغیر ایک کا جسم دوسرے سے ٹس ہو جائے تو اس میں کوئی
مضائقہ نہیں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أَوْتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يَشْتُرُونَ الضَّلَالَةَ وَيُرِيدُونَ أَن تَضِلُّوا السَّبِيلَ ۚ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَائِكُمْ

تم نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جنہیں کتاب کے علم کا کچھ حصہ دیا گیا ہے، وہ خود ضلالت کے خریدار بنے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ گم کر دو۔ اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے

نکاح کی تفصیلی مورت یہ ہے کہ اگر آدمی بے وضو ہے یا اسے غسل کی حاجت ہے اور پانی نہیں ملتا تو تیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ اگر مریض ہے اور غسل یا وضو کرنے سے اس کو نقصان کا اندیشہ ہے تو پانی موجود ہونے کے باوجود تیمم کی اجازت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

تیمم کے معنی قصد کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب پانی نہ ملے یا پانی ہو اور اس کا استعمال ممکن نہ ہو تو پاک مٹی کا قصد کرو۔

تیمم کے طریقے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک دفعہ مٹی پر ہاتھ مار کر منہ پر پھیر لیا جائے پھر دوسری دفعہ ہاتھ مار کر گھنٹیوں تک ہاتھوں پر پھیر لیا جائے۔ امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور اکثر فقہاء کا یہی مذہب ہے اور صحابہ و تابعین میں سے حضرت علی، عبداللہ بن عمر، حسن بصری، شعبی اور سالم بن عبد اللہ وغیرہم اس کے قائل تھے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک صرف ایک دفعہ ہی ہاتھ مارنا کافی ہے۔ وہی ہاتھ منہ پر بھی پھیر لیا جائے اور اسی کو کافی تک ہاتھوں پر بھی پھیر لیا جائے۔ کہیں تک مسح کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ عطاء اور محول اور اوزاعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا مذہب ہے اور عموماً حضرات اہل حدیث اسی کے قائل ہیں۔

تیمم کے لیے ضروری نہیں کہ زمین ہی پر ہاتھ مارا جائے۔ اس غرض کے لیے ہر گرد آلود چیز اور ہر وہ چیز جو خشک اجزاء اور مٹی پر مشتمل ہو کافی ہے۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس طرح مٹی پر ہاتھ مار کر منہ اور ہاتھوں پر پھیر لینے سے آخر طہارت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ آدمی میں طہارت کی جس اور نماز کا احترام قائم رکھنے کے لیے ایک اہم نفسیاتی تدبیر ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہے کہ آدمی خواہ کتنی ہی مدت تک پانی استعمال کرنے پر قادر نہ ہو، بہر حال اس کے اندر طہارت کا احساس برقرار رہے گا، پاکیزگی کے جو قوانین شریعت میں مقرر کر دیے گئے ہیں ان کی پابندی وہ برابر کرتا رہے گا اور اس کے ذہن سے قابل نماز ہونے کی حالت اور قابل نماز نہ ہونے کی حالت کا فرق و امتیاز کبھی محو نہ ہو سکے گا۔

اچھے علماء اہل کتاب کے متعلق قرآن نے اکثر یہ الفاظ استعمال کیے ہیں کہ ”انہیں کتاب کے علم کا کچھ حصہ دیا گیا ہے“ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل قرآنوں نے کتاب الہی کا ایک حصہ گم کر دیا تھا۔ پھر جو کچھ کتاب الہی میں سے اُن کے پاس موجود

وَكُفَىٰ بِاللَّهِ وَلِيًّا ۖ وَكُفَىٰ بِاللَّهِ نَصِيرًا ﴿۵۱﴾ مِنَ الَّذِينَ هَادُوا
يَحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا
وَأَسْمَعُ غَيْرَ مُسْمِعٍ وَارْعِنَا لَيًّا بِالسِّنِّتِهِمْ وَطَعْنًا فِي
الدِّينِ وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأَسْمَعُ وَانْظُرْنَا

اور تمہاری حمایت و مددگاری کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ جو لوگ یہودی بن گئے ہیں ان میں
کچھ لوگ ہیں جو الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دیتے ہیں اور دین حق کے خلاف نیش زنی کرنے
کے لیے اپنی زبانوں کو توڑ موڑ کر کہتے ہیں سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا اور اَسْمَعُ غَيْرَ مُسْمِعٍ
اور رَاعِنَا۔ حالانکہ اگر وہ کہتے سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا اور اَسْمَعُ اور اَنْظُرْنَا تو یہ

تھاس کی روح اور اس کے مقصد و مدعا سے بھی وہ بیگانہ ہو چکے تھے۔ ان کی تمام دلچسپیاں عقلی بحثوں اور احکام کے جڑ پٹا
اور عقائد کی فلسفیانہ پیچیدگیوں تک محدود تھیں یہی وجہ تھی کہ وہ دین کی حقیقت سے نا آشنا اور دینداری کے جوہر سے
خالی تھے اگرچہ علماء دین اور پیشوایانِ ملت کہے جاتے تھے۔

۵۲ یہ نہیں فرمایا کہ ”یہودی ہیں“ بلکہ یہ فرمایا کہ ”یہودی بن گئے ہیں“ کیونکہ ابتداءً تو وہ بھی مسلمان ہی تھے
جس طرح ہر نبی کی امت اصل میں مسلمان ہوتی ہے، مگر بعد میں وہ صرف یہودی بن کر رہ گئے۔

۵۳ اس کے تین مطلب ہیں: ایک یہ کہ کتاب اللہ کے الفاظ میں رد و بدل کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اپنی
تاویلات سے آیات کتاب کے معنی کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروں کی صحبت
میں آکر ان کی باتیں سنتے ہیں اور واپس جا کر لوگوں کے سامنے غلط طریقہ سے روایت کرتے ہیں۔ بات کچھ کہی جاتی ہے اور
وہ اسے اپنی شرارت سے کچھ کا کچھ بنا کر لوگوں میں مشہور کرتے ہیں تاکہ انہیں بدنام کیا جائے اور ان کے متعلق غلط فہمیاں
پھیل کر لوگوں کو اسلامی جماعت کی طرف آنے سے روکا جائے۔

۵۴ یعنی جب انہیں خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں تو زور سے کہتے ہیں سَمِعْنَا (ہم نے سُن لیا) اور اَسْمَعُ
کہتے ہیں عَصَيْنَا (ہم نے قبول نہیں کیا)۔ یا اَطَعْنَا (ہم نے قبول کیا) کا تلفظ اس انداز سے زبان کو پچکا دے کر کرتے
ہیں کہ عَصَيْنَا بن جاتا ہے۔

۵۵ یعنی دورانِ گفتگو میں جب وہ کوئی بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں اَسْمَعُ

لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَقْوَمًا وَلَكِنْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٣٦﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آوَتُْوا الْكِتَابَ آمِنُوا بَمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَى أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ﴿٣٧﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَ يَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ

انہی کے لیے بہتر تھا اور زیادہ راستبازی کا طریقہ تھا۔ مگر ان پر تو ان کی باطل پرستی کی بدولت اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے اس لیے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔

اسے وہ لوگو جنہیں کتاب دی گئی تھی ایمان لو اس کتاب کو جو ہم نے اب نازل کی ہے اور جو اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی۔ اس پر ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں یا ان کو اسی طرح لغت زدہ کر دیں جس طرح سبت والوں کے ساتھ ہم نے کیا تھا، اور یاد رکھو کہ اللہ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے۔ اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھہرایا اس نے تو

(نہیے) اور پھر ساتھ ہی غیور متبع بھی کہتے ہیں جو ذومعنی ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ ایسے محترم ہیں کہ آپ کو کوئی بات خلاف مرضی نہیں سنائی جاسکتی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں کوئی کچھ سنائے۔ ایک اور مطلب یہ ہے کہ خدا کرے تم ہرے ہو جاؤ۔

۳۶ اس کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ حاشیہ نمبر ۱۰۸۔

۳۷ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو آل عمران حاشیہ نمبر ۲۔

۳۸ ملاحظہ ہو سورہ بقرہ حاشیہ نمبر ۸۲ و ۸۳۔

اَفْتَرَىٰ اِثْمًا عَظِيْمًا ۝۳۸ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ ط
بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاءُ وَلَا يُلْظَمُوْنَ فِتْيًا ۝۳۹ اُنْظُرْ كَيْفَ
يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَكُفِّيْ بِهٖ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۴۰ اَلَمْ تَرَ
اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْحُبِّ

بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی۔

تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جو بہت اپنی پاکیزگی نفس کا دم بھرتے ہیں، حالانکہ پاکیزگی تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اور (انہیں جو پاکیزگی نہیں ملتی تو درحقیقت) ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جاتا۔ دیکھو تو سہی، یہ اللہ پر بھی جھوٹے افترا گھڑنے سے نہیں چوکتے اور ان کے صریح گناہ گار ہونے کے لیے یہی ایک گناہ کافی ہے۔

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حقداریا گیا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ حجت

۴۰ یہ اس لیے فرمایا کہ اہل کتاب اگرچہ انبیاء اور کتب آسمانی کی پیروی کے مدعی تھے مگر شرک میں مبتلا ہو گئے تھے۔

۴۱ اس کا مطلب نہیں ہے کہ آدمی میں شرک نہ کرے باقی دوسرے گناہ دل کھول کر کرتا رہے۔ بلکہ دراصل اس سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ شرک جس کو ان لوگوں نے بہت معمولی چیز سمجھ رکھا تھا، تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے حتیٰ کہ اور گناہوں کی معافی تو ممکن ہے مگر یہ ایسا گناہ ہے کہ معاف نہیں کیا جاسکتا۔ علماء یہود و شریعت کے چھوٹے چھوٹے احکام کا تو بڑا اہتمام کرتے تھے بلکہ ان کا سارا وقت ان جزئیات کی ناپ تولی ہی میں گزرتا تھا جو ان کے فقیہوں نے استنباط و راستنبا کر کے نکالے تھے، مگر شرک ان کی نگاہ میں ایسا ہلکا فعل تھا کہ نہ خود اس سے بچنے کی فکر کرتے تھے، نہ اپنی قوم کو شرک کا نہ خیالات اور اعمال سے بچانے کی کوشش کرتے تھے، اور نہ مشرکین کی دوستی اور حمایت ہی میں انہیں کوئی مضائقہ نظر آتا تھا۔

۴۲ حجت کے اصل معنی بے حقیقت، بے اصل اور بے فائدہ چیز کے ہیں۔ اسلام کی زبان میں جادو، کائنات (جوئی)، فال گیری، ٹوٹے ٹوٹکے، شگون اور مہورت اور تمام دوسری وحی و خیالی باتوں کو "حجت" سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ حدیث میں آیا ہے النبیاقۃ والطیر من الجہت۔ یعنی جانوروں کی آوازوں سے فال لیتا، زمین پر جانوروں کے

وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَؤُلَاءِ أَهْدَى مِنَ
الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا ۝ اُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۖ
مَنْ يَلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ يَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ۝ اَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ
مِّنَ الْمُلْكِ فَاذَا لَا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ۝ اَمْ يَحْسُدُونَ
النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ فَقَدْ اُتِيَْنَا اِلٰ

اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ
صحیح راستے پر ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کر دے
پھر تم اس کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔ کیا حکومت میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو
یہ دوسروں کو ایک پھوٹی کوڑی تک نہ دیتے۔ پھر کیا یہ دوسروں سے اس لیے حسد کرتے
ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا؟ اگر یہ بات ہے تو انہیں معلوم ہو کہ ہم نے تو براہیم

نشاطات قدم سے شگون نکالنا اور فال گیری کے دوسرے طریقے سب "جبت" کے قبیل سے ہیں پس "جبت" کا مفہوم وہی ہے
جسے ہم اردو زبان میں اوبام کہتے ہیں اور جس کے لیے انگریزی میں (Superstitions) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

۵۸۲ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ حاشیہ نمبر ۲۸۶ و ۲۸۸۔

۵۸۳ علماء یہودی ہٹ دھری یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے ان کو
وہ مشرکین عرب کی بر نسبت زیادہ گراہ قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان سے تو یہ مشرکین ہی زیادہ راہ راست پر ہیں۔ حالانکہ
وہ صریح طور پر دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف خالص توحید ہے جس میں شرک کا شائبہ تک نہیں اور دوسری طرف صریح بت
پرستی ہے جس کی مذمت سے ساری بائبل بھری پڑی ہے۔

۵۸۴ یعنی کیا خدا کی حکومت کا کوئی حصہ ان کے قبضہ میں ہے کہ یہ فیصلہ کرنے چلے ہیں کہ کون برسر ہدایت ہے
اور کون نہیں ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو ان کے ہاتھوں دوسروں کو ایک پھوٹی کوڑی بھی نصیب نہ ہوتی کیونکہ ان کے دل تو
اتنے چھوٹے ہیں کہ ان سے حق کا اعتراف تک نہیں ہو سکتا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا ان کے پاس کسی ملک
کی حکومت ہے کہ اس میں دوسرے لوگ حصہ بنانا چاہتے ہیں اور یہ انہیں اس میں سے کچھ نہیں دینا چاہتے؟ یہاں تو مفوض
اعتراف حق کا سوال درپیش ہے اور اس میں بھی یہ نکل سے کام لے رہے ہیں۔

إِبْرَاهِيمَ الْكَتَبَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا ۝
 فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُمْ مَنْ صَدَّ عَنْهُ ۖ وَكَفَى
 بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ
 نُصْلِيهِمْ نَارًا كَلِمًا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بِدَلِّهِمْ جُلُودًا
 غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝
 وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ

ج

کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی اور ملک عظیم بخش دیا، مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا، اور منہ موڑنے والوں کے لیے تو جس جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے انہیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کریں گے تاکہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں، اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا اور نیک عمل کیے ان کو ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے

۵۵ یعنی یہ اپنی نااہلی کے باوجود اللہ کے جس فضل اور جس انعام کی اس خود لگائے بیٹھے تھے اس سے جب دوسرے لوگ سرفراز کر دیے گئے اور عرب کے اُمیوں میں ایک عظیم الشان نبی کے ظہور سے وہ دُوعانی و اخلاقی اور ذہنی و عملی زندگی پیدا ہو گئی جس کا لازمی نتیجہ عروج و سر بلندی ہے، قراب یہ اس پر حسد کر رہے ہیں اور یہ باتیں اسی حسد کی بنا پر ان کے منہ سے نکل رہی ہیں۔

۵۶ ”ملک عظیم“ سے مراد دنیا کی امامت و رہنمائی اور اقوام عالم پر قائمانہ اقتدار ہے جو کتاب اللہ کا علم پانے اور اس علم و حکمت کے مطابق عمل کرنے سے لازماً حاصل ہوتا ہے۔

۵۷ یاد رہے کہ یہاں جواب بنی اسرائیل کی حاسدانہ باتوں کا دیا جا رہا ہے۔ اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ آخر جتنے کس بات پر ہو، تم بھی ابراہیم کی اولاد ہو اور یہ بنی اسماعیل بھی ابراہیم ہی کی اولاد ہیں۔ ابراہیم سے دینا

تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا لَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا ظِلِيلًا ۝
إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝

جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور ان کو پاکیزہ بیویاں ملیں گی اور انھیں ہم گھنی چھاؤں میں رکھیں گے۔

مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو، اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔

کی امامت کا جو وعدہ ہم نے کیا تھا وہ آل ابراہیم میں سے صرف ان لوگوں کے لیے تھا جو ہماری بیٹی ہوتی کتابت حکمت کی پیروی کریں۔ یہ کتاب اور حکمت پہلے ہم نے تمہارے پاس بھیجی تھی مگر تمہاری اپنی نالائقی تھی کہ تم اس سے منہ موڑ گئے۔ اب وہی چیز ہم نے بنی اسرائیل کو دی ہے اور یہ ان کی خوش نصیبی ہے کہ وہ اس پر ایمان لے آئے ہیں۔

۵۵ یعنی تم ان برائتوں سے بچے رہنا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے ہیں۔ بنی اسرائیل کی بنیادی غلطیوں میں ایک یہ تھی کہ انہوں نے اپنے اخطاؤں کے زمانہ میں امانتیں یعنی ذمہ داری کے منصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سرمداری کے مرتبے (Positions of trust) ایسے لوگوں کو دینے شروع کر دیے جو نااہل، کم ظرف، بد اخلاق، بد دیانت اور بدکار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم غراب ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کو ہدایت کی جارہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا بلکہ امانتیں ان لوگوں کے سپرد کرنا جو ان کے اہل ہوں، یعنی جن میں بارامانت اٹھانے کی صلاحیت ہو، بنی اسرائیل کی دوسری بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ انصاف کی روح سے خالی ہو گئے تھے۔ وہ شخصی اور قومی اغراض کے لیے بے تحاشہ ایمان بگڑ جاتے تھے۔ مرتع ہٹ دھرمی برت جاتے تھے۔ انصاف کے گلے پر پٹھری پھیرنے میں انہیں ذرا تاثر نہ ہوتا تھا۔ ان کی بے انصافی کا تلخ ترین تجربہ اس زمانہ میں خود مسلمانوں کو ہو رہا تھا۔ ایک طرف ان کے سامنے ہمدردی نہیں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي
الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں
صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو
صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والوں کی پاکیزہ زندگیاں تھیں۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو نبیوں کو پوج رہے تھے
یہیوں کو زندہ گاڑتے تھے، سوتیلی ماؤں تک سے نکاح کر لیتے تھے اور کعبہ کے گرد بار بار زانوٹکے ہو کر طواف کرتے تھے۔
یہ نام نہاد اہل کتاب ان میں سے دوسرے گروہ کو پہلے گروہ پر ترجیح دیتے تھے اور ان کو یہ کہتے ہوئے ذرا شرم نہ آتی تھی کہ
پہلے گروہ کے مقابلہ میں یہ دوسرا گروہ زیادہ صحیح راستہ پر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس بے انصافی پر تنبیہ کرنے کے بعد اب
مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ تم کہیں ایسے بے انصاف نہ بن جانا۔ خواہ کسی سے دوستی ہو یا دشمنی، بہر حال بات جب کہو
انصاف کی کہو اور فیصلہ جب کہو عدل کے ساتھ کرو۔

۸۹ یہ آیت اسلام کے پورے مذہبی، تمدنی اور سیاسی نظام کی بنیاد اور اسلامی ریاست کے دستور کی
اولین دفعہ ہے۔ اس میں حسب ذیل اصول مستقل طور پر قائم کر دیے گئے ہیں:

(۱) اسلامی نظام میں اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ ایک مسلمان سب سے پہلے بندہ خدا ہے، باقی جو کچھ بھی ہے اس کے
بعد ہے۔ مسلمان کی انفرادی زندگی، اور مسلمانوں کے اجتماعی نظام، دونوں کا مرکز و محور خدا کی فرمانبرداری اور وفاداری
ہے۔ دوسری اطاعتیں اور وفاداریاں صرف اس صورت میں قبول کی جائیں گی کہ وہ خدا کی اطاعت اور وفاداری کی
تو مقابل نہ ہوں بلکہ اس کے تحت اور اس کی تابع ہوں۔ ورنہ ہر وہ حلقہ اطاعت توڑ کر پھینک دیا جائے گا جو اس اصل اور
بنیادی اطاعت کا حریف ہو۔ یہی بات ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ لا طاعة لمخلوق
في معصية الخالق۔ خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں ہے۔

(۲) اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسول کی اطاعت ہے۔ یہ کوئی مستقل بالذات اطاعت نہیں ہے بلکہ اطاعت
خدا کی واحد عملی صورت ہے۔ رسول اس لیے مطاع ہے کہ وہی ایک مستند ذریعہ ہے جس سے ہم تک خدا کے احکام اور فرامین
پہنچتے ہیں۔ ہم خدا کی اطاعت صرف اسی طریقہ سے کر سکتے ہیں کہ رسول کی اطاعت کریں۔ کوئی اطاعت خدا رسول کی سند
کے بغیر معتبر نہیں ہے اور رسول کی پیروی سے منہ موڑنا خدا کے خلاف بغاوت ہے۔ اسی مضمون کو یہ حدیث واضح کرتی ہے
کہ من اطاعني فقد اطاع الله ومن عصاني فقد عصي الله جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور
جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی۔ اور یہی بات خود قرآن میں پوری وضاحت کے ساتھ آگے آ رہی ہے۔

(۳) مذکورہ بالا دونوں اطاعتوں کے بعد اور ان کے ماتحت تیسری اطاعت جو اسلامی نظام میں مسلمانوں پر واجب ہے وہ ان "اولی الامر" کی اطاعت ہے جو خود مسلمانوں میں سے ہوں۔ "اولی الامر" کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار ہوں، خواہ وہ ذہنی و فکری رہنمائی کرنے والے علماء ہوں یا سیاسی رہنمائی کرنے والے لیڈر یا ملکی انتظام کرنے والے محکام، یا علاقائی فیصلے کرنے والے جج یا تمدنی و معاشرتی امور میں قبیلوں اور رستیوں اور محلوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار۔ غرض جو جس حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحب امر ہے وہ اطاعت کا مستحق ہے اور اس سے نزاع کر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں خلل ڈالنا درست نہیں ہے بشرطیکہ وہ خود مسلمانوں کے گروہ میں سے ہو اور خدا و رسول کا مطیع ہو۔ یہ دونوں شرطیں اس اطاعت کے لیے لازمی شرطیں ہیں اور یہ نہ صرف آیت مذکورہ صدر میں صاف طور پر درج ہیں، بلکہ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان فرما دیا ہے مثلاً حسب ذیل احادیث ملاحظہ ہوں :

السمع والطاعة على المرء	مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سنے اور طاعت کرے
المسلم في ما احب وكره ما لم يؤمر بمعصية فاذا امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة۔ (بخاری و مسلم)	خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند تا وقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ کچھ سنانا چاہیے نہ ماننا چاہیے۔
لا طاعة في معصية افاض الطاعة في المعروف۔ (بخاری و مسلم)	خدا اور رسول کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت جو کچھ بھی ہے "معروف" میں ہے۔
يكون عليكم امراء تعذفون وتنكرون فمن انكر فقد برئ ومن كره فقد سلم ولكن من رضى وتابع فقلوا افلا نقاتلهم؟ قال لا ما صلوا۔ (مسلم)	صغور نے فرمایا تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناراضی کیا وہ بری القدرہ ہوگا۔ اور جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا۔ مگر جو ان پر راضی ہوگا اور پیروی کرنے لگا وہ مآخوذ ہوگا۔ صحابہ نے پوچھا پھر جب ایسے محکام کا دور آئے تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ آپ نے فرمایا نہیں جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں۔

یعنی ترک نماز وہ علامت ہوگی جس سے صریح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ وہ اطاعت خدا و رسول سے باہر ہو گئے ہیں اور پھر ان کے خلاف جدوجہد کرنا درست ہوگا۔

يُشَارُ اِثْمَكُمْ الذِّينَ تَبْغِضُونَهُمْ وَيُبْغِضُونَكُمْ وَتُبْغِضُونَهُمْ وَيُبْغِضُونَكُمْ قُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ اَخْلَا سَابِقَهُمْ عِنْدَ ذَلِكَ؟ قَالَ	صغور نے فرمایا تمہارے بدترین سردار وہ ہیں جو تمہارے لیے مبغض ہوں اور تم ان کے لیے مبغض ہو۔ تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! جب یہ صورت ہو تو کیا ہم ان کے مقابلہ پر نہ اٹھیں؟ فرمایا نہیں، جب تک کہ وہ تمہارے
--	--

لا ما اقاموا فيكم الصلوة، لا ما اقاموا فيكم الصلوة۔ (مسلم) قائم کرتے رہیں۔ جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔

اس حدیث میں اُپر والی شرط کو اور زیادہ واضح کر دیا گیا ہے۔ اُپر کی حدیث سے گمان ہو سکتا تھا کہ اگر وہ اپنی انفرادی زندگی میں نماز کے پابند ہوں تو ان کے خلاف بغاوت نہیں کی جاسکتی۔ لیکن یہ حدیث بتاتی ہے کہ نماز پڑھنے سے مراد دراصل مسلمانوں کی جماعتی زندگی میں نماز کا نظام قائم کرنا ہے۔ یعنی صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ لوگ خود پابند نماز ہوں، بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے تحت جو نظام حکومت چل رہا ہو وہ کم از کم اقامتِ صلوة کا انتظام کرے۔ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ ان کی حکومت اپنی اُمّوی نوعیت کے اعتبار سے ایک اسلامی حکومت ہے۔ ورنہ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ حکومت اسلام سے منحرف ہو چکی ہے اور اسے اُٹ پھینکنے کی سعی مسلمانوں کے لیے جائز ہو جائے گی۔ اسی بات کو ایک اور روایت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے من جملہ اہل باؤقک ایک اس امر کا عہد بھی لیا کہ ان لا تنازع الاہل الا ان تروا کفرا بواحا عندی کہ من اللہ فیہ برہان یعنی یہ کہ ہم اپنے سرداروں اور محتام سے نزاع نہ کریں گے، بالآخر یہ کہ ہم ان کے کاسوں میں کھلا کھلا کفر دیکھیں جس کی موجودگی میں ان کے خلاف ہمارے پاس خدا کے حضور پیش کرنے کے لیے دلیل موجود ہو۔ (بخاری و مسلم)

(۴) چوتھی بات جو ایت زیر بحث میں ایک مستقل اور قطعی اُمّول کے طور پر لے کر دی گئی ہے یہ ہے کہ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند (Final authority) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلہ میں بھی نزاع واقع ہوگی اس میں فیصلہ کے لیے قرآن اور سنت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور جو فیصلہ وہاں سے حاصل ہوگا اس کے سامنے سب تسلیم کر دیں گے۔ اس طرح تمام مسائل زندگی میں کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کو سند اور مرجع اور حریف آخر تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ لازمی خصوصیت ہے جو اسے کافرانہ نظام زندگی سے میز کرتی ہے۔ جس نظام میں یہ چیز نہ پائی جائے وہ بالیقین ایک غیر اسلامی نظام ہے۔

اس موقع پر بعض لوگ یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ تمام مسائل زندگی کے فیصلہ کے لیے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی طرف کیسے رجوع کیا جاسکتا ہے جبکہ یہو سبیل اور دیوے اور ڈاک خانہ کے قواعد و ضوابط اور ایسے ہی بے شمار معاملات کے احکام سرے سے وہاں موجود ہی نہیں ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ شبہ اُمّول دین کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ مسلمان کو جو چیز کافر سے میز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کافر مطلق آزادی کا دعوٰی ہے اور مسلمان فی الاصل بندہ ہونے کے بعد صرف اُس دائرے میں آزادی سے متمتع ہوتا ہے جو اس کے رب نے اُسے دی ہے۔ کافر اپنے سارے معاملات کا فیصلہ خود اپنے بنائے ہوئے اُمّول اور قوانین اور ضوابط کے مطابق کرتا ہے اور سرے سے کسی خدائی سند کا اپنے آپ کو حاجت مند سمجھتا ہی نہیں۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے ہر معاملہ میں سب سے پہلے خدا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع کرتا ہے، پھر اگر وہاں سے کوئی حکم ملے تو وہ اس کی پیروی کرتا ہے، اور اگر کوئی حکم نہ ملے تو وہ صرف داسی صورت میں آزادی عمل برتتا ہے اور اُس کی یہ آزادی عمل اس محنت پر مبنی ہوتی ہے کہ اس معاملہ میں شارع کا کوئی حکم نہ دینا اس کی

إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۖ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا

اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے یا

اے نبی! تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، مگر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں، حالانکہ انہیں طاعتِ حق سے آزادی عمل عطا کیے جانے کی دلیل ہے۔

۹۔ قرآن مجید چونکہ محض کتابِ آئین ہی نہیں ہے بلکہ کتابِ تعلیم و تلقین اور صحیفہ و عطا و ارشاد بھی ہے، اس لیے پہلے فقرے میں جو قانونی اصول بیان کیے گئے تھے، اب اس دوسرے فقرے میں ان کی حکمت و مصلحت سمجھائی جا رہی ہے۔ اس میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں: ایک یہ کہ مذکورہ بالا چاروں اصولوں کی پیروی کرنا ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ مسلمان ہونے کا دعویٰ اور ان اصولوں سے انحراف، یہ دونوں چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ دوسرے یہ کہ ان اصولوں پر اپنے نظامِ زندگی کو تعمیر کرنے ہی میں مسلمانوں کی بہتری بھی ہے۔ صرف یہی ایک چیز ان کو دنیا میں صراطِ مستقیم پر قائم رکھ سکتی ہے اور اسی سے ان کی عاقبت بھی درست ہو سکتی ہے۔ یہ نصیحت ٹھیک اُس تقریر کے خاتمہ پر ارشاد ہوئی ہے جس میں یہودیوں کی اخلاقی و دینی حالت پر تبصرہ کیا جا رہا تھا۔ اس طرح ایک نہایت لطیف طریقہ سے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تمہاری پیش رو امتِ دین کے ان بنیادی اصولوں سے منحرف ہو کر جس پستی میں گر چکی ہے اس سے عبرت حاصل کرو۔ جب کوئی گروہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی ہدایت کو پس پشت ڈال دیتا ہے، اور ایسے سر و ارجوں اور رہنماؤں کے پیچھے لگ جاتا ہے جو خدا و رسول کے مطیع فرمان نہ ہوں، اور اپنے مذہبی پیشواؤں اور سیاسی حاکموں سے کتاب و سنت کی سند پوچھے بغیر ان کی اطاعت کرنے لگتا ہے تو وہ اُن خرابیوں میں مبتلا ہونے سے کسی طرح بچ نہیں سکتا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہوئے۔

بِهِ ۖ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝۹۱
قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَى مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ
الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا ۝۹۲ فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْكُمُ
مُصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمْتُمْ أَيْدِيَكُمْ ثُمَّ جَاءَ وَكُ يَحْلِفُونَ ۝۹۳

کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہِ راست سے بہت دُور لے جانا چاہتا ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسول کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں۔ پھر اُس وقت کیا ہوتا ہے جب ان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ان پر آپڑتی ہے؟ اُس وقت یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں۔

۹۱ یہاں صریح طور پر ”طاغوت“ سے مراد وہ حاکم ہے جو قانونِ الہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو، اور وہ نظامِ عدالت ہے جو نہ تو اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو۔ لہذا یہ آیت اس معنی میں بالکل صاف ہے کہ جو عدالت ”طاغوت“ کی حیثیت رکھتی ہو اس کے پاس اپنے معاملات فیصلہ کے لیے لے جانا ایمان کے منافی ہے اور خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی ایسی عدالت کو جائز عدالت تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ قرآن کی رو سے اللہ پر ایمان اور طاغوت سے کفر دونوں لازم و ملزوم ہیں، اور خدا اور طاغوت دونوں کے آگے بیک وقت جھکنا عین منافقت ہے۔

۹۲ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقین کی عام روش تھی کہ جس مقدمہ میں انہیں توقع ہوتی تھی کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا اس کو تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آتے تھے مگر جس مقدمہ میں اندیشہ ہوتا تھا کہ فیصلہ ان کے خلاف ہوگا اس کو آپ کے پاس لانے سے انکار کر دیتے تھے۔ یہی حال اب بھی بہت سے منافقوں کا ہے کہ اگر شریعت کا فیصلہ ان کے حق میں ہو تو سر آنکھوں پر دور نہ ہر اُس قانون، ہر اس رسم و رواج اور ہر اس عدالت کے دامن میں جا پناہ لیں گے جس سے انہیں اپنے منشاء کے مطابق فیصلہ حاصل ہونے کی توقع ہو۔

۹۳ غالباً اس سے مراد یہ ہے کہ جب ان کی اس منافقانہ حرکت کا مسلمانوں کو علم ہو جاتا ہے اور انہیں خوف ہوتا ہے کہ اب باز پرس ہوگی اور سزا ملے گی اُس وقت قسمیں کھا کھا کر اپنے ایمان کا یقین دلانے لگتے ہیں۔

بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا اِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ۝۱۱۱ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ
 اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْۙ فَاَعْرَضَ عَنْهُمْ وَعَظَّمْهُمْ وَاَقْلَلَهُمْ
 فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا ۝۱۱۲ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا
 لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ
 فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ
 تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝۱۱۳ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ
 فِيْمَا شَجَرَبَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْۤا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا

اور کہتے ہیں کہ خدا کی قسم ہم تو صرف بھلائی چاہتے تھے اور ہماری نیت تویہ تھی کہ فریقین میں کسی
 طرح موافقت ہو جائے۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، ان سے تعرض مت کرو،
 انہیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو جو ان کے دلوں میں اتر جائے۔ (انہیں بتاؤ کہ) ہم نے جو رسول بھی
 بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اذن خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔ اگر انہوں نے یہ
 طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے تو تمہارے پاس آجاتے اور اللہ سے
 معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی کی درخواست کرتا، تو یقیناً اللہ کو بخشنے والا اور رحم
 کرنے والا پاتے۔ نہیں، اے محمدؐ، تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی
 اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی

۹۴ یعنی خدا کی طرف سے رسول اس لیے نہیں آتا ہے کہ بس اس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور پھر اطاعت
 جس کی چاہو کرتے رہو۔ بلکہ رسول کے آنے کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے، تمام قوانین کو
 چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے اور خدا کی طرف سے جو احکام وہ دیتا ہے، تمام احکام کو چھوڑ کر صرف انہی پر عمل
 کیا جائے۔ اگر کسی نے یہی نہ کیا تو پھر اس کا محض رسول کو رسول مان لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ أَوْ أَخْرِجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ مَا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ مِنْهُمْ وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَأَشَدَّ تَثْبِيثًا ۝ وَإِذْ آلَيْنَاهُمْ مِنْ لَدُنَّا أَجْرًا عَظِيمًا ۝ وَلَهْدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ۝ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ

تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سرسری تسلیم کر لیں۔ اگر ہم نے انہیں حکم دیا ہوتا کہ اپنے آپ کو ہلاک کر دو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو ان میں سے کم ہی آدمی اس پر عمل کرتے۔ حالانکہ جو نصیحت انہیں کی جاتی ہے اگر یہ اس پر عمل کرتے تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتری اور زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا اور جتنا ایسا کرتے تو ہم انہیں اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتے اور انہیں سیدھا راستہ دکھا دیتے جو اللہ اور رسول کی اطاعت

۹۵ اس آیت کا حکم صرف حضور کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے لیے ہے۔ جو کچھ اللہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور جس طریقہ پر اللہ کی ہدایت و رہنمائی کے تحت آپ نے عمل کیا ہے وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کن سند ہے اور اس سند کو ماننے یا نہ ماننے ہی پر آدمی کے مومن ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ ہے۔ حدیث میں اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے کہ لایؤمن احدکم حتی یکون ہواہ تبعاً لما جئت بہ۔ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اس طریقہ کی تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر آیا ہوں۔

۹۶ یعنی جب ان کا حال یہ ہے کہ شریعت کی پابندی کرنے میں ذرا سا نقصان یا تھوڑی سی تکلیف بھی یہ برداشت نہیں کر سکتے تو ان سے کسی بڑی قربانی کی ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی۔ اگر جان دینے یا گھر بار چھوڑنے کا مطالبہ ان سے کیا جائے تو یہ فوراً بھاگ کھڑے ہوں گے اور ایمان و اطاعت کے بجائے کفر و نافرمانی کی راہ میں گئے۔

۹۷ یعنی اگر یہ لوگ شک اور تذبذب اور تردد و چھوڑ کر کیسوٹی کے ساتھ رسول کی اطاعت و پیروی پر قائم ہو جاتے اور ڈانواں ڈول نہ رہتے تو ان کی زندگی تزلزل سے محفوظ ہو جاتی۔ ان کے خیالات، اخلاق اور معاملات سب کے سب ایک مستقل اور پائدار بنیاد پر قائم ہو جاتے اور یہ ان برکات سے بہرہ ور ہوتے جو ایک شاہراہ مستقیم پر ثابت قدمی کے ساتھ چلنے سے ہی حاصل ہوا کرتی ہیں۔ جو شخص تذبذب اور تردد کی حالت میں مبتلا ہو کبھی اس راستہ پر

فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَ
الصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ
رَفِيقًا ۚ ذَٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ عَلِيمًا ۝

کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور
شہداء اور صالحین۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں۔ یہ حقیقی فضل ہے جو اللہ کی طرف
سے ملتا ہے اور حقیقت جاننے کے لیے بس اللہ ہی کا علم کافی ہے ۛ

چلے اور کبھی اس راستہ پر اور اطمینان کسی راستہ کے بھی صحیح ہونے پر اسے حاصل نہ ہو اس کی ساری زندگی نقشِ بر آب کی طرح
بسر ہوتی ہے اور سعیِ لا حاصل بن کر رہ جاتی ہے۔

۹۸ یعنی جب وہ شک چھوڑ کر ایمان و یقین کے ساتھ رسول کی اطاعت کا فیصلہ کر لیتے تو اللہ کے فضل سے
اُن کے سامنے سچی و عمل کا سیدھا راستہ بالکل روشن ہو جاتا اور انہیں صاف نظر آ جاتا کہ وہ اپنی قوتیں اور محنتیں کس راہ
میں صرف کریں جس سے ان کا ہر قدم اپنی حقیقی منزل مقصود کی طرف اُٹھے۔

۹۹ صدیقی سے مراد وہ شخص ہے جو نہایت راست باز ہو جس کے اندر صداقت پسندی اور حق پرستی
کمال درجہ پر ہو جو اپنے معاملات اور برتاؤ میں ہمیشہ سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کرے، جب ساتھ دے تو حق اور انصاف
ہی کا ساتھ دے اور بچے دل سے دے اور جس چیز کو حق کے خلاف پائے اس کے مقابل میں ٹوٹ کر کھڑا ہو جائے اور ذرا
کڑوری نہ دکھائے۔ جس کی سیرت ایسی شہری اور بے لوث ہو کہ اپنے اور غیر کسی کو بھی اس سے خالص راست دہی کے
سوا کسی دوسرے طرز عمل کا اندیشہ نہ ہو۔

شہید کے اصل معنی گواہ کے ہیں۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے ایمان کی صداقت پر اپنی زندگی کے پورے
طرز عمل سے شہادت دے۔ اللہ کی راہ میں لوگ جان دینے والے کو بھی شہید اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ جان دے کر
ثابت کر دیتا ہے کہ وہ جس چیز پر ایمان لایا تھا اسے واقعی سچے دل سے حق سمجھتا تھا اور اسے اتنا عزیز رکھتا تھا کہ اس کے
لیے جان قربان کرنے میں بھی اس نے دریغ نہ کیا۔ ایسے راست باز لوگوں کو بھی شہید کہا جاتا ہے جو اس قدر قابلِ اعتماد ہوں
کہ جس چیز پر وہ شہادت دیں اس کا صحیح و برحق ہونا بلا تامل تسلیم کر لیا جائے۔

صالح سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے خیالات اور عقائد میں اپنی نیت اور ارادوں میں اور اپنے اقوال و افعال
میں راہِ راست پر قائم ہو اور فی الجملہ اپنی زندگی میں نیک رویہ رکھتا ہو۔

۱۰۰ یعنی وہ انسان خوش قسمت ہے جسے ایسے لوگ دنیا میں رفاقت کے لیے میسر آئیں اور جس کا انجسام

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوا ثُبَاتٍ أَوْ تَنْفِرُوا
جَمِيعًا ۚ وَإِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَيُبَطِّئَنَّ فَإِنْ أَصَابَكُمْ مُصِيبَةٌ
قَالَ قَدْ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيَّ إِذْ لَمْ أَكُنْ مَعَهُمْ شَهِيدًا ۚ وَلَئِنْ
أَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِنَ اللَّهِ لَيَقُولَنَّ كَأَنْ لَمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مقابلہ کے لیے ہر وقت تیار رہو، پھر جیسا موقع ہو الگ الگ دستوں
کی شکل میں نکلویا اکٹھے ہو کر۔ ہاں، تم میں کوئی کوئی آدمی ایسا بھی ہے جو لڑائی سے جی چھڑاتا ہے، اگر
تم پر کوئی مصیبت آئے تو کہتا ہے اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ گیا، اور اگر اللہ
کی طرف سے تم پر فضل ہو تو کہتا ہے۔ اور اس طرح کہتا ہے کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا

آخرت میں بھی ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہو۔ کسی آدمی کے احساسات مژدہ ہو جائیں تو بات دوسری ہے، اور نہ
درحقیقت بدسیرت اور بدکردار لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا دنیا ہی میں ایک عذاب الیم ہے کجا کہ آخرت میں بھی
آدمی انہی کے ساتھ اُس انجام سے دوچار ہو جو ان کے لیے مقدر ہے۔ اسی لیے اللہ کے نیک بندوں کی ہمیشہ
یہی تتر رہی ہے کہ ان کو نیک لوگوں کی سوسائٹی نصیب ہو اور مر کر بھی وہ نیک ہی لوگوں کے ساتھ رہیں۔

۱۱۱ واضح رہے کہ یہ خطبہ اس زمانہ میں نازل ہوا تھا جب اُحد کی شکست کی وجہ سے اطراف و فواحش
کے قبائل کی ہتھیں بڑھ گئی تھیں اور مسلمان ہر طرف سے خطرات میں گھر گئے تھے۔ آٹھ دن خبریں آتی رہتی تھیں کہ فلاں
قبیلہ کے تیور بگڑ رہے ہیں، فلاں قبیلہ دشمنی پر آمادہ ہے، فلاں مقام پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ
پے درپے خداریاں کی جا رہی تھیں۔ ان کے مبلغین کو فریب سے دعوت دی جاتی تھی اور قتل کر دیا جاتا تھا۔ مدینہ
کے حدود سے باہر ان کے لیے جان و مال کی سلامتی باقی نہ رہی تھی۔ ان حالات میں مسلمانوں کی طرف سے ایک
زبردست سہی و جہاد اور سخت جان فحاشی کی ضرورت تھی تاکہ ان خطرات کے ہجوم سے اسلام کی یہ تحریک
بٹ نہ جائے۔

۱۱۲ ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ خود توحی چھڑاتا ہی ہے، دوسروں کی بھی ہتھیں پست کرتا ہے اور ان کو
جہاد سے روکنے کے لیے ایسی باتیں کرتا ہے کہ وہ بھی اُسی کی طرح بیٹھ رہیں۔

وَبَيْنَهُ مَوَدَّةٌ تَلِيَّتَنِي كُنْتُ مَعَهُمْ فَافُوزُ فَوْزًا عَظِيمًا ﴿٤٢﴾
 فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا
 بِالْآخِرَةِ ۖ وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ
 نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٤٣﴾ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
 وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ
 يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ
 لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۖ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ﴿٤٤﴾

تو کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔ کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑا کام بن جاتا۔ (ایسے لوگوں کو معلوم ہو کہ) اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیے ان لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دُنیا کی زندگی کو فروخت کر دیں، پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اُسے ضرور ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پاکر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس ہستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔

۴۳ یعنی اللہ کی راہ میں لڑنا دنیا طلب لوگوں کا کام ہے ہی نہیں۔ یہ تو ایسے لوگوں کا کام ہے جن کے پیش نظر صرف اللہ کی خوشنودی ہو، جو اللہ اور آخرت پر کامل اعتماد رکھتے ہوں اور دنیا میں اپنی کامیابی و خوشحالی کے سانسے امکانات اور اپنے ہر قسم کے دُنوی مفاد اس اُمید پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں کہ ان کا رب ان سے راضی ہوگا اور اس دنیا میں نہیں تو آخرت میں بہر حال ان کی قربانیاں ضائع نہ ہوں گی۔ رہے وہ لوگ جن کی نگاہ میں اصل اہمیت اپنے دُنوی مفاد ہی کی ہو تو درحقیقت یہ راستہ ان کے لیے نہیں ہے۔

۴۴ اشارہ ہے اُن مظلوم بچوں، عورتوں اور مردوں کی طرف جو کہ میں اور عرب کے دوسرے قبائل میں اسلام قبول کر چکے تھے مگر نہ ہجرت پر قادر تھے اور نہ اپنے آپ کو ظلم سے بچا سکتے تھے۔ یہ غریب طرح طرح سے



الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا
يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ
إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا ۝ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ
لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ فَلَمَّا
كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ
كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كُتِبَتْ

جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنہوں نے کفر کا
راستہ اختیار کیا ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں، پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور
یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں ۝

تم نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو
اور زکوٰۃ دو، اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے
ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہیے یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر۔ کہتے ہیں خدایا! یہ ہم پر لڑائی

تحتہ مشق ستم بنائے جا رہے تھے اور دعائیں مانگتے تھے کہ کوئی انہیں اس ظلم سے بچائے۔

۱۰۵۔ یہ اللہ کا دو ٹوک فیصلہ ہے۔ اللہ کی راہ میں اس غرض کے لیے لڑنا کہ زمین پر اللہ کا دین قائم ہو
اہل ایمان کا کام ہے اور جو واقعی مومن ہے وہ اس کام سے کبھی باز نہ رہے گا۔ اور طاغوت کی راہ میں اس غرض کے لیے
لڑنا کہ خدا کی زمین پر خدا کے باغیوں کا راج ہو، یہ کافروں کا کام ہے اور کوئی ایمان رکھنے والا آدمی یہ کام نہیں کر سکتا۔

۱۰۶۔ یعنی بظاہر شیطان اور اس کے ساتھی بڑی تیاریوں سے اُٹھتے ہیں اور بڑی زبردست چالیں چلتے
ہیں لیکن اہل ایمان کو نہ اُن کی تیاریوں سے خوف زدہ ہونا چاہیے اور نہ ان کی چالوں سے۔ آخر کار ان کا انجام
ناکامی ہے۔

۱۰۷۔ اس آیت کے تین مفہوم ہیں اور تینوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں :

عَلَيْنَا الْقِتَالُ لَوْلَا أَخَذْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ قُلْ مَتَاعُ
الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۖ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا تُظْلَمُونَ
فَتِيلًا ۖ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَدْرِكُكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي
بُرُوجٍ مُّشِيدَةٍ ۖ وَإِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَذِهِ
مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَذِهِ

کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی؟ ان سے کہو، دنیا کا سرمایہ زندگی
تھوڑا ہے، اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لیے زیادہ بہتر ہے، اور تم پر ظلم ایک شتمہ برابر
بھی نہ کیا جائے گا۔ رہی موت، تو جہاں بھی تم ہو وہ بہر حال تمہیں آکر رہے گی خواہ تم کیسی ہی
مضبوط عمارتوں میں ہو۔

اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں

ایک مغموم یہ ہے کہ پہلے یہ لوگ خود جنگ کے لیے بے تاب تھے۔ بار بار کہتے تھے کہ صاحب ہم پر ظلم کیا
جا رہا ہے، ہمیں ستایا جاتا ہے، مارا جاتا ہے، لگائیاں دی جاتی ہیں، آخر ہم کب تک صبر کریں، ہمیں مقابلہ کی اجازت
دی جائے۔ اُس وقت ان سے کہا جاتا تھا کہ صبر کرو اور نماز و زکوٰۃ سے ابھی اپنے نفس کی اصلاح کرتے رہو، تو یہ صبر
برداشت کا حکم ان پر شاق گزرتا تھا۔ مگر اب جو لڑائی کا حکم دے دیا گیا تو انہی تقاضا کرنے والوں میں سے ایک گروہ
دشمنوں کا ہجوم اور جنگ کے خطرات دیکھ دیکھ کر سہا جا رہا ہے۔

دوسرا مغموم یہ ہے کہ جب تک مطالبہ نماز اور زکوٰۃ اور ایسے ہی بے خطر کاموں کا تھا اور جانیں بڑانے کا کوئی
سوال درمیان میں نہ آیا تھا یہ لوگ بے دیندار تھے۔ مگر اب جو حق کی خاطر جان و کھوں کا کام شروع ہوا تو ان پر رزہ
طاری ہونے لگا۔

تیسرا مغموم یہ ہے کہ پہلے تو ٹوٹ کھسوٹ اور نفسانی لڑائیوں کے لیے ان کی تلوار ہر وقت نیام سے نکلی پڑتی تھی
اور رات دن کا شغل ہی جنگ و پیکار تھا۔ اُس وقت انہیں غوریزی سے ہاتھ روکنے اور نماز و زکوٰۃ سے نفس کی اصلاح
کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اب جو خدا کے لیے تلوار اٹھانے کا حکم دیا گیا تو وہ لوگ جو نفس کی خاطر لڑنے میں شیر دل تھے،

مِنْ عِنْدِكَ ۖ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ ۖ فَمَالِ هَؤُلَاءِ الْقَوْمِ
لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا ۝ مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ
فَإِنَّ اللَّهَ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ ۚ وَأَرْسَلْنَاكَ
لِلنَّاسِ رَسُولًا ۖ وَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا ۝ مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ
فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۚ وَمَنْ تَوَلَّىٰ فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِظًا ۝

تمہاری بدولت ہے۔ کہو سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

اے انسان! تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسبِ عمل کی بدولت ہے۔

اے محمد! ہم نے تم کو لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی۔ اور جو منہ موڑ گیا، تو بہر حال ہم نے تمہیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔

خدا کی خاطر لڑنے میں بزدل بنے جاتے ہیں۔ دودست شمشیر زن جو نفس اور شیطان کی راہ میں بڑی تیزی دکھاتا تھا اب خدا کی راہ میں شل ہڑا جاتا ہے۔

یہ تینوں مفہوم مختلف قسم کے لوگوں پر چسپاں ہوتے ہیں اور آیت کے الفاظ ایسے جامع ہیں کہ تینوں پر یکساں دلالت کرتے ہیں۔

۱۰۸ یعنی اگر تم خدا کے دین کی خدمت بجالاؤ اور اس کی راہ میں جانفشانی دکھاؤ تو یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کے ہاں تمہارا اجر ضائع ہو جائے۔

۱۰۹ یعنی جب فتح و ظفر اور کامیابی و مسرورئی نصیب ہوتی ہے تو اسے اللہ کا فضل قرار دیتے ہیں اور مجبور جاتے ہیں کہ اللہ نے ان پر فضل بھیجی ہی کے ذریعہ سے فرمایا ہے۔ مگر جب خود اپنی غلیظوں اور کمزوریوں کے سبب سے کہیں شکست ہوتی ہے اور بڑھتے ہوئے قدم پیچھے ہٹنے لگتے ہیں تو سارا الزام نبی کے سر تھوپتے ہیں اور خود بڑی الذمہ

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ
غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ
وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا ۝۸۱
الْقُرْآنُ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا
كَثِيرًا ۝۸۲ وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ
وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ

وہ منہ پر کہتے ہیں کہ ہم مطیع فرمان ہیں۔ مگر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے
ایک گروہ راتوں کو جمع ہو کر تمہاری باتوں کے خلاف مشورے کرتا ہے۔ اللہ ان کی یہ ساری
سرگوشیاں لکھ رہا ہے۔ تم ان کی پروا نہ کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو، وہی بھروسہ کے لیے کافی
ہے۔ کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں
بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔

یہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش یا خوفناک خبر سن پاتے ہیں اُسے لے کر پھیلا دیتے ہیں حالانکہ
اگر یہ اُسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو
ہونا چاہتے ہیں۔

اللہ یعنی اپنے عمل کے یہ خود ذمہ دار ہیں۔ ان کے اعمال کی باز پرس تم سے نہ ہوگی۔ تمہارے سپرد جو کام
کیا گیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ اللہ کے احکام و ہدایات ان تک پہنچا دو۔ یہ کام تم نے بخوبی انجام دے دیا۔ اب یہ
تمہارا کام نہیں ہے کہ ہاتھ پکڑ کر انہیں زبردستی راہِ راست پر چلاؤ۔ اگر یہ اُس ہدایت کی پیروی نہ کریں جو تمہارے ذریعہ سے
پہنچ رہی ہے، تو اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ لوگ کیوں نافرمانی کرتے تھے۔
اللہ منافق اور ضعیف الایمان لوگوں کی جس روش پر اُپر کی آیتوں میں تنبیہ کی گئی ہے اس کی بڑی اور مہلی
وجہ یہ تھی کہ انہیں قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں شک تھا۔ انہیں یقین نہ آتا تھا کہ رسول پر واقعی وحی اُترتی ہے اور

يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۖ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ
لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٨٣﴾ فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا
تُكَلِّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَكُفَّ
بِأَسَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۗ وَاللَّهُ أَشَدُّ بَاسًا وَأَشَدُّ تَنكِيلًا ﴿٨٤﴾
مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِنْهَا ۚ

ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں۔ تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو (تمہاری کمزوریاں ایسی تھیں کہ) محدود دے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے۔

پس اے نبی! تم اللہ کی راہ میں لڑو، تم اپنی ذات کے سوا کسی اور کے لیے ذمہ دار نہیں ہو۔ البتہ اہل ایمان کو لڑنے کے لیے اکساؤ، بعد نہیں کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے، اللہ کا زور سب سے زیادہ زبردست اور اس کی سزا سب سے زیادہ سخت ہے جو بھلائی کی سفارش کریگا وہ اس میں حصہ

یہ جو کچھ ہدایات آ رہی ہیں براہ راست خدا ہی کے پاس سے آ رہی ہیں۔ اسی لیے ان کی منافقانہ روش پر ملامت کرنے کے بعد اب فرمایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ قرآن پر غور ہی نہیں کرتے ورنہ یہ کلام تو خود شہادت دے رہا ہے کہ یہ خدا کے سوا کسی دوسرے کا کلام جو نہیں سکتا۔ کوئی انسان اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ماہہا سال تک وہ مختلف حالات میں، مختلف مواقع پر مختلف مضامین پر تقریریں کرتا رہے اور اقول سے آخر تک اس کی ساری تقریریں ایسا ہموار ایک رنگ، متناسب مجرور بن جائیں جس کا کوئی جزو دوسرے جزو سے متصادم نہ ہو، جس میں تبدیلی رائے کا کہیں نشان تک نہ ملے، جس میں حکم کے نفس کی مختلف کیفیات اپنے مختلف رنگ نہ دکھائیں اور جس پر کبھی نظر ثانی تک کی ضرورت نہ پیش آئے۔

۱۱۲ وہ چونکہ ہنگامہ کا موقع تھا اس لیے ہر طرف افواہیں اُڑ رہی تھیں۔ کبھی خطرے کی بے بنیاد بانٹنے اور ان سے یکایک مدینہ اور اس کے اطراف میں پریشانی پھیل جاتی۔ کبھی کوئی چالاک دشمن کسی واقعی خطرے کی چھپانے کے لیے اطمینان بخش خبریں بھیج دیتا اور لوگ انہیں سن کر غفلت میں مبتلا ہو جاتے۔ ان افواہوں میں وہ لوگ بڑی دلچسپی لیتے تھے جو محض ہنگامہ پسند تھے، جن کے لیے اسلام اور جاہلیت کا یہ معرکہ کوئی سنجیدہ معاملہ نہ تھا، جنہیں کچھ

وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِنْهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ مُقِيتًا ۝ وَإِذَا حُيِّيتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنِ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ۝ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لِيَجْمَعَ بَيْنَكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا ۝



پائے گا اور جو بُرائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا، اور اللہ ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے۔

اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمہیں سلام کرے تو اس کو اس سے بہتر طریقہ کے ساتھ جواب دو یا کم از کم اُسی طرح، اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہ تم سب کو اُس قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، اور اللہ کی بات سے بڑھ کر سچی بات اور کس کی ہو سکتی ہے؟

خبر نہ تھی کہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ افواہیں پھیلانے کے نتائج کس قدر دُور رس ہوتے ہیں۔ ان کے کان میں جہاں کئی بھنگ پڑ جاتی اسے لے کر جگہ جگہ پھرتے پھرتے تھے۔ انہی لوگوں کو اس آیت میں سرزنش کی گئی ہے اور انہیں سختی کے ساتھ تنبیہ دی گئی ہے کہ افواہیں پھیلانے سے باز رہیں اور ہر خبر جو ان کو پہنچے اسے ذمہ دار لوگوں تک پہنچا کر خاموش ہو جائیں۔

۱۱۳۔ یعنی یہ اپنی اپنی پسند اور اپنا اپنا نصیب ہے کہ کوئی خدا کی راہ میں کوشش کرنے اور حق کو سر بلند کرنے کے لیے لوگوں کو ابھارے اور اس کا اجر پائے، اور کوئی خدا کے بندوں کو غلط فہمیوں میں ڈالنے اور ان کی ہمتیں پست کرنے اور انہیں اعلائے کلمۃ اللہ کی سعی و جہد سے باز رکھنے میں اپنی قوت صرف کرے، اور اس کی سزا کا مستحق بنے۔

۱۱۴۔ اُس وقت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات نہایت کشیدہ ہو رہے تھے، اور جیسا کہ تعلقات کی کشیدگی میں جوا کرتا ہے، اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں مسلمان دوسرے لوگوں کے ساتھ کج تعلقی سے نہ پیش آنے لگیں۔ اس لیے انہیں ہدایت کی گئی کہ جو تمہارے ساتھ احترام کا برتاؤ کرے اس کے ساتھ تم بھی ویسے ہی بلکہ اس سے زیادہ احترام سے پیش آؤ۔ شائستگی کا جواب شائستگی ہی ہے، بلکہ تمہارا منصب یہ ہے کہ دوسروں سے بڑھ کر شائستہ ہو۔ ایک داعی و مبلغِ گروہ کے لیے جو دنیا کو راہِ راست پر لانے اور مسلکِ حق کی طرف دعوت دینے کے لیے اُٹھا ہوا درشت مزاجی، ترش زبونی اور تلخ کلامی ستا نہیں ہے۔ اس سے نفس کی تسکین تر ہو جاتی ہے مگر اُس مقصد کو اٹا نقصان پہنچتا ہے جس کے لیے وہ اُٹھا ہے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِتْنَةٍ وَاللَّهُ أَرَزَكُمْ بِهِمْ مَبَاكِبًا

پھر یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقین کے بارے میں تمہارے درمیان دو رائیں پائی جاتی ہیں حالانکہ جو بُرائیاں انہوں نے کمائی ہیں اُن کی بدولت اللہ انہیں اُلٹا پھیر چکا ہے۔

۱۱۵ یعنی کافر اور مشرک اور ملحد اور دہریے جو کچھ کر رہے ہیں اس سے خدا کی خدائی کا کچھ نہیں بگڑتا اور خدا نے واحد اور خدائے مطلق ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو کسی کے بدلے بدل نہیں سکتی۔ پھر ایک دن وہ سب انسانوں کو جمع کر کے ہر ایک کو اس کے عمل کا نتیجہ دکھا دے گا۔ اس کی قدرت کے احاطے سے بچ کر کوئی بھاگ بھی نہیں سکتا۔ لہذا خدا ہرگز اس بات کا ماحبت مند نہیں ہے کہ اس کی طرف سے کوئی اس کے باغیوں پر جیلے دل کا بخار نکالتا پھر اسے اور کچھ خلقی و ترش کلامی کو زخمِ دل کا مرہم بنائے۔

یہ تو اس آیت کا تعلق اوپر کی آیت سے ہے۔ لیکن یہی آیت اس پورے سلسلہ کلام کا خاتمہ بھی ہے جو پچھلے دو تین رکوعوں سے چلا آ رہا ہے۔ اس حیثیت سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں جو شخص جس طریقے پر چاہے چلتا رہے اور جس راہ میں اپنی کوششیں اور محنتیں صرف کرنا چاہتا ہے کیے جائے، آخر کار سب کو ایک دن اس خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پھر ہر ایک اپنی سعی و عمل کے نتائج دیکھ لے گا۔

۱۱۶ یہاں اُن منافق مسلمانوں کے سلسلہ سے بحث کی گئی ہے جو مکہ میں اور عرب کے دوسرے حصوں میں اسلام تو قبول کر چکے تھے، مگر ہجرت کر کے دارالاسلام کی طرف منتقل ہونے کے بجائے بدستور اپنی کافر قوم ہی کے ساتھ رہتے بیٹھے تھے اور کم و بیش اُن تمام کارروائیوں میں علما حصہ لیتے تھے جو ان کی قوم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کرتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ سخت چسپیدہ تھا کہ ان کے ساتھ آخر کیا معاملہ کیا جائے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ کچھ بھی ہو، آخر یہ ہیں تو مسلمان ہی۔ کھڑے رہتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ کفار کا معاملہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس رکوع میں اسی اختلاف کا فیصلہ فرمایا ہے۔

اس موقع پر ایک بات کو واضح طور پر سمجھ لینا ضروری ہے، ورنہ اندیشہ ہے کہ نہ صرف اس مقام کو، بلکہ قرآن مجید کے اُن تمام مقامات کو سمجھنے میں آدمی ٹھوکر کھائے گا جہاں ہجرت نہ کرنے والے مسلمانوں کو منافقین میں شمار کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی اور ایک چھوٹا سا خطہ عرب کی سرزمین میں ایسا ہم پہنچ گیا جہاں ایک مومن کے لیے اپنے دین و ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنا ممکن تھا، تو عام حکم دے دیا گیا کہ جہاں جہاں جس جس علاقے اور جس جس قبیلے میں اپنی ایمان کفار سے دے ہوئے ہیں اور اسلامی زندگی بسر کرنے کی آزادی نہیں رکھتے، وہاں سے وہ ہجرت کریں اور مدینہ کے دارالاسلام میں آجائیں۔ اُس وقت جو لوگ ہجرت کی قدرت رکھتے تھے اور پھر صرف اس لیے اُٹھ کر نہ آئے کہ انہیں اپنے گھر بار، اعزہ و اقربا اور اپنے مفادات اسلام کی بد نسبت عزیز تر تھے، وہ سب منافق قرار دیے گئے۔ اُو

اَتُرِيدُونَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَنْ يُضِلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ
تَجِدَ لَهُ سَبِيْلًا ۝ وَّذُوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ
سَوَاءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَاءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ فَلَنْ تُوَلُّوْا فِتْنَهُهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُمُوْهُمْ
وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَلَا نَصِيْرًا ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ

کیا تم چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے ہدایت نہیں بخشی اُسے تم ہدایت بخش دو، حالانکہ جس کو اللہ نے راستہ سے ہٹا دیا اُس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پاسکتے۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں اسی طرح تم بھی کافر ہو جاؤ تاکہ تم اور وہ سب یکساں ہو جائیں۔ لہذا ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے نہ آجائیں، اور اگر وہ ہجرت کے باز رہیں تو جہاں پاؤ انہیں پکڑو اور قتل کرو اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔ البتہ وہ منافق اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم جو لوگ حقیقت میں بالکل مجبور تھے، ان کو ”مُشَفِّعِیْن“ میں شمار کیا گیا، جیسا کہ آگے رکوع ۱۳ میں آ رہا ہے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ دار الکفر کے رہنے والے کسی مسلمان کو محض ہجرت نہ کرنے پر منافق صرف اس صورت میں کہا جاسکتا ہے جبکہ دارالاسلام کی طرف سے ایسے تمام مسلمانوں کو یا تو دعوت عام ہو یا کم از کم اس نے ان کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے ہوں۔ اس صورت میں بلاشبہ وہ سب مسلمان منافق قرار پائیں گے جو دار الکفر کو دارالاسلام بنانے کی کوئی سعی بھی نہ کریں ہوں، اور استطاعت کے باوجود ہجرت بھی نہ کریں۔ لیکن اگر دارالاسلام کی طرف سے نہ تو دعوت ہی ہو اور نہ اس نے اپنے دروازے ہی مہاجرین کے لیے کھلے رکھے ہوں، تو اس صورت میں صرف ہجرت نہ کرنا کسی شخص کو منافق نہ بنادے گا بلکہ وہ منافق صرف اسی وقت کہلائے گا جبکہ فی الواقع کوئی منافقانہ کام کرے۔

۱۱۱ یعنی جس دورنگی اور مصلحت پرستی اور ترجیح دینا بر آخرت کا اکتساب انہوں نے کیا ہے اس کی بدولت اللہ نے انہیں اسی طرف بھیر دیا ہے جس طرف سے یہ آئے تھے۔ انہوں نے کفر سے نکل کر اسلام کی طرف پیش قدمی کی تو ضرورت تھی، مگر اس مرحلہ میں آئے اور پھرنے کے لیے یکسو ہو جانے کی ضرورت تھی، ہر اُس مفاد کو قربان کر دینے کی ضرورت تھی جو اسلام دایمان کے مفاد کے عکس ہو، مادہ آخرت پر ایسے یقین کی ضرورت تھی جس کی بنا پر آدمی اطمینان کے ساتھ اپنی دنیا کو قربان کر سکتا ہو۔ یہ ان کو گوارا نہ ہوا

إِلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيثَاقٌ أَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ
 أَنْ يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ
 فَلَقَتُلُوكُمْ فَإِنْ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَالْقُوا إِلَيْكُمْ
 السَّلَامَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ۝ سَتَجِدُونَ أَخْرَيْنَ
 يُرِيدُونَ أَنْ يُبَايِعُواكُمْ وَيُبَايِعُوا قَوْمَهُمْ مُكَلَّمًا رُدُّوا إِلَى الْفِتْنَةِ
 أَوْ يُنْفِرُ مِنْهَا فَإِنْ لَمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَيُلْقُوا إِلَيْكُمْ السَّلَامَ وَيَكْفُوا
 أَيْدِيَهُمْ فَاخْذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأُولَئِكَ

جائیں جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے۔ اسی طرح وہ منافق بھی ستھنی ہیں جو تمہارے پاس
 آتے ہیں اور لڑائی سے دل برداشتہ ہیں، نہ تم سے لڑنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم سے۔
 اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے۔ لہذا اگر وہ تم سے کنارہ کش
 ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے
 تمہارے لیے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔ ایک اور قسم کے منافق تمہیں ایسے
 ملیں گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی، اگر جب کبھی فتنہ کا موقع
 پائیں گے اس میں کود پڑیں گے۔ ایسے لوگ اگر تمہارے مقابلہ سے باز نہ رہیں اور صلح و سلامتی
 تمہارے آگے پیش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو جہاں وہ ملیں انہیں پکڑو اور مارو، ان پر

اس لیے جدھر سے آئے تھے اُسے پاؤں اُدھر ہی واپس چلے گئے۔ اب ان کے معاملہ میں اختلاف کا کوئی موقع باقی ہے؟

۱۱۸ یہ حکم ان منافق مسلمانوں کا ہے جو برسرِ جنگ کافر قوم سے تعلق رکھتے ہوں اور اسلامی حکومت کے خلاف

معاذ اللہ کارروائیوں میں علاحدہ ہیں۔

۱۱۹ یہ استثنا اس حکم سے نہیں ہے کہ "انہیں دوست اور مددگار نہ بنایا جائے، بلکہ اس حکم سے ہے کہ انہیں

جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ
يَقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَاۗءً ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاۗءً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ
مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَّةٌ مُّسْلَمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ ۚ اِلَّا اَنْ يَّصَدَّقُوْا ۚ فَاِنْ
كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ

ہاتھ اٹھانے کے لیے ہم نے تمہیں کھل مکت دی ہے ۝

کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسرے مومن کو قتل کرے، الا یہ کہ اس سے چوک ہو جائے۔
اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کرے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کرے
اور مقتول کے وارثوں کو خونبھا دے، الا یہ کہ وہ خونبھا معاف کر دیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان مقتول کسی
ایسی قوم سے تھا جس سے تمہاری دشمنی ہو تو اس کا کفارہ ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے۔

بچہ اور مارا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ واجب القتل منافق کسی ایسی کافر قوم کے حدود میں جا پناہ لیں جس کے ساتھ اسلامی حکومت
کا معاہدہ ہو چکا ہو، تو اس کے علاقے میں ان کا تعاقب نہیں کیا جائے گا اور نہ یہی جائز ہوگا کہ دارالاسلام کا کوئی مسلمان غیر جانبدار
ملک میں کسی واجب القتل منافق کو پائے اور اسے مار ڈالے۔ احترام درہل منافق کے خون کا نہیں بلکہ معاہدے کا ہے۔

۱۲۰ یہاں اُن منافق مسلمانوں کا ذکر نہیں ہے جن کے قتل کی اوپر اجازت دی گئی ہے، بلکہ اُن مسلمانوں کا ذکر ہے
جو یا تو دارالاسلام کے باشندے ہوں، یا اگر دارالحرب یا دارالکفر میں بھی ہوں تو دشمنان اسلام کی کارروائیوں میں اُن کی شرکت
کا کوئی ثبوت نہ ہو۔ اُس وقت بکثرت لوگ ایسے بھی تھے جو اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی حقیقی جمہوریوں کی بنا پر دشمن اسلام
قبیلوں کے درمیان ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور اکثر ایسے اتفاقات پیش آ جاتے تھے کہ مسلمان کسی دشمن قبیلہ پر حملہ کرتے اور وہاں
ناراضگی میں کوئی مسلمان ان کے ہاتھ سے مارا جاتا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں اس صورت کا حکم بیان فرمایا ہے جبکہ غلطی سے
کوئی مسلمان کسی مسلمان کے ہاتھ سے مارا جائے۔

۱۲۱ چونکہ مقتول مومن تھا اس لیے اس کے قتل کا کفارہ ایک مومن غلام کی آزادی قرار دیا گیا۔

۱۲۲ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خونبھا کی مقدار سو اونٹ، یا دوسو گائیں، یا دو ہزار بکریاں مقرر فرمائی ہے۔ اگر دوسری
کسی شکل میں کوئی شخص خونبھا دینا چاہے تو اس کی مقدار انہی چیزوں کی بازاری قیمت کے لحاظ سے معین کی جائے گی۔ مثلاً نبی صلی اللہ
علیہ وسلم کے زمانہ میں نقد خونبھا دینے والوں کے لیے ۸ سو دینار یا ۸ ہزار درہم مقرر تھے۔ جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو انہوں نے

وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ
اِلَىٰ اَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ فَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ
مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۲﴾

اور اگر وہ کسی ایسی غیر مسلم قوم کا فرد تھا جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو غول بہت
دیا جائے گا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہوگا۔ پھر جو غلام نہ پائے وہ پے درپے دو مہینے کے
روزے رکھے۔ یہ اس گناہ پر اللہ سے توبہ کرنے کا طریقہ ہے اور اللہ علیم و دانہ ہے۔

فرمایا کہ اونٹوں کی قیمت اب پڑھ گئی ہے، لہذا اب سونے کے سکے میں ایک ہزار دینار یا چاندی کے سکے میں ۱۲ ہزار درہم خریدا
دلوایا جائے گا۔ مگر واضح رہے کہ غنہا کی یہ مقدار جو مقرر کی گئی ہے قتل عمد کی صورت کے لیے نہیں ہے بلکہ قتل خطا کی صورت
کے لیے ہے۔

۱۲۳ اس آیت کے احکام کا خلاصہ یہ ہے:

اگر مقتول دارالاسلام کا باشندہ ہو تو اس کے قاتل کو غنہا بھی دینا ہوگا اور خدا سے اپنے قصور کی معافی مانگنے کے
لیے ایک غلام بھی آزاد کرنا ہوگا۔

اگر وہ دارالحرب کا باشندہ ہو تو قاتل کو صرف غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اس کا غنہا کچھ نہیں ہے۔

اگر وہ کسی ایسے دارالکفر کا باشندہ ہو جس سے اسلامی حکومت کا معاہدہ ہے تو قاتل کو ایک غلام آزاد کرنا ہوگا اور اس کے
معاہدہ غنہا بھی دینا ہوگا، لیکن غنہا کی مقدار وہی ہوگی جتنی اس معاہدہ قوم کے کسی غیر مسلم فرد کو قتل کر دینے کی صورت میں از روئے
معاہدہ دی جانی چاہیے۔

۱۲۴ یعنی روزے مسلسل رکھے جائیں بیچ میں ناغہ نہ ہو۔ اگر کوئی شخص عذر شرعی کے بغیر ایک روزہ بھی بیچ میں چھوڑ
دے تو از سر نو روزوں کا سلسلہ شروع کرنا پڑے گا۔

۱۲۵ یعنی یہ ”جرمانہ“ نہیں بلکہ ”توبہ“ اور ”کفارہ“ ہے۔ جرمانہ میں ندامت و شرمساری اور اصلاح نفس کی کوئی روح
نہیں ہوتی بلکہ عمرانہ و سخت ناگواری کے ساتھ مجبوراً دیا جاتا ہے اور پیزاری و تلخی اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ برعکس اس کے اللہ تعالیٰ
چاہتا ہے کہ جس بندے سے خطا ہوئی ہے وہ عبادت اور کار خیر اور ادا نئے حقوق کے ذریعہ سے اس کا اثر اپنی روح پر سے دھو کر
اور شرمساری و ندامت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرے تاکہ نہ صرف یہ گناہ معاف ہو بلکہ آئندہ کے لیے اس کا نفس ایسی غلطیوں
کے اعادہ سے بھی محفوظ رہے۔ کفارہ کے لغوی معنی ہیں ”پھیلانے والی چیز“ کسی کار خیر کو گناہ کا کفارہ قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَدًّا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خُلِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ﴿٣١﴾
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْفَى إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ

راہ وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔
اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب ہتیا کر رکھا ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو تو دوست دشمن میں تمیز کرو
اور جو تمہاری طرف سلام سے تقدیم کرے اُسے فوراً نہ کہو کہ تو مومن نہیں ہے۔ اگر تم مونیوی فائدہ

نیکی اُس گناہ پر چھا جاتی ہے اور اسے ڈھانک لیتی ہے، جیسے کسی دیوار پر داغ لگ گیا ہو اور اس پر سفیدی پھیر کر داغ کا اثر مٹا دیا جائے۔
﴿٣١﴾ ابتدائے اسلام میں "السلام علیکم" کا لفظ مسلمانوں کے لیے شمار اور علامت کی حیثیت رکھتا تھا اور ایک مسلمان
دوسرے مسلمان کو دیکھ کر یہ لفظ اس معنی میں استعمال کرتا تھا کہ میں تمہارے ہی گروہ کا آدمی ہوں، دوست اور غیر خواہ میں میرے پاس
تمہارے لیے سلامتی و معافیت کے سوا کچھ نہیں ہے، لہذا نہ تم مجھ سے دشمنی کرو اور نہ میری طرف سے عداوت اور ضرر کا اندیشہ رکھو۔
جس طرح فوج میں ایک لفظ شعار (Password) کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے اور رات کے وقت ایک فوج کے آدمی ایک دوسرے
کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے اس غرض کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ فوج مخالفت کے آدمیوں سے میز ہوں، اسی طرح سلام
کا لفظ بھی مسلمانوں میں شمار کے طور پر مقرر کیا گیا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ اُس زمانہ میں اس شعار کی اہمیت اس وجہ سے آویچی
زیادہ تھی کہ اس وقت عرب کے مسلمانوں اور کافروں کے درمیان لباس، زبان اور کسی دوسری چیز میں کوئی نمایاں ہستی یا نہ تھا
جس کی وجہ سے ایک مسلمان سرسری نظر میں دوسرے مسلمان کو پہچان سکتا ہو۔

لیکن لڑائیوں کے موقع پر ایک چھپیدگی یہ پیش آتی تھی کہ مسلمان جب کسی دشمن گروہ پر حملہ کرتے اور وہاں کوئی مسلمان
اس پیٹ میں آجاتا تو وہ حملہ آور مسلمانوں کو یہ بتانے کے لیے کہ وہ بھی ان کا دینی بھائی ہے "السلام علیکم" یا "لا الہ الا اللہ"
پکارتا تھا، مگر مسلمانوں کو اس پر یہ شبہ جوتا تھا کہ یہ کوئی کافر ہے جو بعض جان بچانے کے لیے جیلہ کر رہا ہے، اس لیے بسا اوقات
وہ اسے قتل کر بیٹھتے تھے اور اس کی چیزیں قیمت کے طور پر لوٹ لیتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہر موقع پر نہایت سختی کے
ساتھ سرزنش فرمائی، مگر اس قسم کے واقعات برابر پیش آتے رہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس چھپیدگی کو حل کیا۔
آیت کا منشا یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے اس کے متعلق تمہیں سرسری طور پر فیصلہ کر لینے کا

الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَازٍ كَثِيْرَةٌ ۖ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ
فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝۹۳
لَّا يَسْتَوِي الْقُعْدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولٰٓئِ الضَّرَبِ وَا
الْمُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ
اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقُعْدٰٓئِ دَرَجَةً ۖ
وَكُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى

چاہتے ہو تو اللہ کے پاس تمہارے لیے بہت سے اموال غنیمت ہیں۔ آخر اسی حالت میں تم خود
بھی تو اس سے پہلے مبتلا رہ چکے ہو، پھر اللہ نے تم پر احسان کیا، لہذا تحقیق سے کام لو، جو کچھ
تم کرتے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔

مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی
راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں، دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں
کی نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے۔ اگرچہ ہر ایک کے لیے
اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اُس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ

حق نہیں ہے کہ وہ معن جان بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سچا ہو اور ہو سکتا ہے کہ جھوٹا ہو حقیقت و تحقیق
ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ تحقیق کے بغیر چھوڑ دینے میں اگر یہ امکان ہے کہ ایک کا فر جھوٹ بول کر جان بچالے جائے تو قتل کر دینے
میں اس کا امکان بھی ہے کہ ایک مومن بے گناہ تمہارے ہاتھ سے مارا جائے۔ اور بہر حال تمہارا ایک کا فر کو چھوڑ دینے میں غلطی کرنا
اس سے بدرجہا زیادہ بہتر ہے کہ تم ایک مومن کو قتل کرنے میں غلطی کرو۔

۱۲۷ یعنی ایک وقت تم پر بھی ایسا گزر چکا ہے کہ انفرادی طور پر مختلف کافر قبیلوں میں منتشر تھے، اپنے اسلام کو
ظلم و ستم کے خوف سے چھپانے پر مجبور تھے، اور تمہارے پاس ایمان کے زبانی اقرار کے سوا اپنے ایمان کا کوئی ثبوت موجود
نہ تھا۔ اب یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تم کو اجتماعی زندگی عطا کی اور تم اس قابل ہوئے کہ کفار کے مقابل میں اسلام کا جھنڈا

الْفَعِيدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ۖ دَرَجَاتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَرَحْمَةً ۖ
وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۖ إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي
أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۖ

بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے، اُن کے لیے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے، اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے ۚ

جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے اُن کی رُو حیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو اُن سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔

بلند کرنے اٹھے ہو۔ اس احسان کا یہ کوئی صحیح شکر یہ نہیں ہے کہ جو مسلمان ابھی پہلی حالت میں مبتلا ہیں ان کے ساتھ تم نرمی و رعایت سے کام نہ لو۔

۱۲۸ یہاں اُن بیٹھنے والوں کا ذکر نہیں ہے جن کو جہاد پر جانے کا حکم دیا جائے اور وہ بہانے کے بیٹھے رہیں، یا غیر عام ہو اور جہاد فرض میں ہو جائے پھر بھی وہ جنگ پر جانے سے جی چرائیں۔ بلکہ یہاں ذکر اُن بیٹھے والوں کا ہے جو جہاد کے فرض کفایہ ہونے کی صورت میں میدان جنگ کی طرف جانے کے بجائے دوسرے کاموں میں لگے رہیں۔ پہلی دو صورتوں میں جہاد کے لیے نہ بچنے والا صرف منافق ہی ہو سکتا ہے اور اس کے لیے اللہ کی طرف سے کسی کی بھلائی کا وعدہ نہیں ہے الا یہ کہ وہ کسی حقیقی معذوری کا شکار ہو۔ بخلاف اس کے یہ آخری صورت ایسی ہے جس میں اسلامی جماعت کی پوری فوجی طاقت مطلوب نہیں ہوتی بلکہ محض اس کا ایک حصہ مطلوب ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر اہم کی طرف سے ایمل کی جائے کہ کون سربراہ ہیں جو فلاح ہم کیلئے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں تو جو لوگ اس دعوت پر بیک کئے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں وہ افضل ہیں بہ نسبت اُن کے جو دوسرے کاموں میں لگے رہیں، خواہ وہ دوسرے کام بھی بجائے خود مفید ہی ہوں۔

۱۲۹ مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ابھی تک بلا کسی مجبوری و معذوری کے اپنی کافر قوم ہی کے درمیان مقیم تھے اور نیم مسلمانہ اور نیم کفرانہ زندگی بسر کرتے پر راضی تھے، درآغاییکہ ایک دارالاسلام میں ہوا چکا تھا جس کی طرف ہجرت کر کے اپنے دین و اعتقاد کے مطابق پوری اسلامی زندگی بسر کرنا ان کے لیے ممکن ہو گیا تھا۔ یہی ان کا اپنے نفس پر ظلم تھا کیونکہ ان کو پوری اسلامی زندگی کے مقابلہ میں اس نیم کفر و نیم اسلام پر جس چیز نے قانع و مطمئن کر رکھا تھا وہ کوئی واقعی مجبوری نہ تھی بلکہ محض اپنے نفس کے عیش اور اپنے خاندان، اپنی جائیداد و مالاک اور اپنے دنیوی مفاد کی ہمت تھی جسے انہوں نے اپنے دین پر ترجیح دی۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۱۱۶)۔

قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَأْوَهُمْ
 جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝۱۹ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ
 وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ۝۲۰
 فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُو عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ۝۲۱
 وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرْغًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۝۲۲
 وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ
 الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝۲۳

فرشتوں نے کہا، کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے، بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے، اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔ جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لیے بڑی گنجائش پائے گا، اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لیے نکلے، پھر راستہ ہی میں اُسے موت آجائے اُس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا، اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے ۝

۱۳۰ یعنی جب ایک جگہ خدا کے باغیوں کا غلبہ تھا اور خدا کے قانون شرعی پر عمل کرنا ممکن نہ تھا تو وہاں رہنا کیا ضرور تھا؟ کیوں نہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسی سرزمین کی طرف منتقل ہو گئے جہاں قانون الہی کی پیروی ممکن ہوتی؟
 ۱۳۱ یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جو شخص اللہ کے دین پر ایمان لایا جو اس کے لیے نظام کفر کے تحت زندگی بسر کرنا صحت و دوہی صورتوں میں جائز ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اسلام کو اس سرزمین میں غالب کرنے اور نظام کفر کو نظام اسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کرتا رہے جس طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے ابتدائی پیرو کرتے رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ درحقیقت وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہوا درحقیقت نفرت و بیزاری کے ساتھ وہاں مجبوراً نہ قیام رکھتا ہو۔ ان دو صورتوں

وَإِذَا خَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ

اور جب تم لوگ سفر کے لیے نکلو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر نماز میں اختصار کرو (وخصوصاً)

کے سوا ہر صورت میں دارالکفر کا قیام ایک مستقل معیت ہے اور اس معیت کے لیے یہ عذر کوئی بہت وزنی عذر نہیں ہے کہ ہم دنیا میں کوئی ایسا دارالاسلام پاتے ہی نہیں ہیں جہاں ہم ہجرت کر کے جا سکیں۔ اگر کوئی دارالاسلام موجود نہیں ہے تو کیا خدا کی زمین میں کوئی پہاڑ یا کوئی جنگل بھی ایسا نہیں ہے جہاں آدمی درختوں کے پتے کھا کر اور بکریوں کا دودھ پی کر گزار کر سکتا ہو اور احکام کفر کی اطاعت سے بچا رہے؟

بعض لوگوں کو ایک حدیث سے غلط فہمی ہوئی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے 'لا ہجرت بعد الفتن' یعنی فتح مکہ کے بعد اب ہجرت نہیں ہے۔ حالانکہ دراصل یہ حدیث کوئی دائمی حکم نہیں ہے بلکہ صرف اُس وقت کے حالات میں اہل عرب سے ایسا فرمایا گیا تھا جب تک عرب کا بیشتر حصہ دارالکفر و دارالحرب تھا اور صرف مدینہ و اطراف مدینہ میں اسلامی احکام جاری ہو رہے تھے مسلمانوں کے لیے تاکید یہ حکم تھا کہ ہر طرف سے سختی کے دارالاسلام میں آجائیں۔ مگر جب فتح مکہ کے بعد عرب میں کفر کا زور ٹوٹ گیا اور قریب قریب پورا ملک اسلام کے زیر نگیں آگیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب ہجرت کی حاجت باقی نہیں رہی ہے۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہ تھی کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے تمام حالات میں قیامت تک کے لیے ہجرت کی فریضت منسوخ ہو گئی ہے۔

۱۳۲ھ زمانہ امن کے سفر میں قصر یہ ہے کہ جن اوقات کی نماز میں چار رکعتیں فرض ہیں ان میں دو رکعتیں پڑھی جائیں اور حالت جنگ میں قصر کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے جنگی حالات جس طرح بھی اجازت دیں نماز پڑھی جائے۔ جماعت کا موقع ہو تو جماعت سے پڑھو ورنہ فرداً فرداً ہی سہی۔ قبلہ رخ نہ ہو سکتے ہو تو ہر بھی رخ ہو۔ سواری پر بیٹھے ہوئے اور چلتے ہوئے بھی پڑھ سکتے ہو۔ رکوع و سجدہ ممکن نہ ہو تو اشارہ ہی سے سہی۔ ضرورت پڑے تو نماز ہی کی حالت میں چل بھی سکتے ہو۔ کپڑوں کو غون لگا ہوا ہوتا بھی مضائقہ نہیں۔ ان سب آسانوں کے باوجود اگر ایسی پرخطر حالت ہو کہ کسی طرح نماز نہ پڑھی جاسکے تو مجبوراً مؤخر کی جائے جیسے جنگ خندق کے موقع پر ہوا۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ سفر میں صرف فرض پڑھے جائیں یا سنتیں بھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ آپ سفر میں فجر کی سنتوں اور عشا کے وتر کا التزام فرماتے تھے مگر باقی اوقات میں صرف فرض پڑھتے تھے، سنتیں پڑھنے کا التزام آپ سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ نقل نمازوں کا جب موقع ملتا تھا پڑھ لیا کرتے تھے حتیٰ کہ سواری پر بیٹھے ہوئے بھی پڑھتے رہتے تھے۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن عمر نے لوگوں کو سفر میں فجر کے سوا دوسرے اوقات کی سنتیں پڑھنے سے منع کیا ہے۔ مگر اکثر علماء ترک اور فصل دونوں کو جائز قرار دیتے ہیں اور اسے بندے کے اختیار پر چھوڑ دیتے ہیں۔ حنفیہ کا مذاہب یہ ہے کہ مسافر جب راستہ طے کر رہا ہو تو سنتیں نہ پڑھنا افضل ہے اور جب کسی مقام پر منزل کرے اور امینان حاصل ہو تو پڑھنا افضل ہے۔

جس سفر میں قصر کیا جاسکتا ہے اس کے لیے بعض ائمہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ فی سبیل اللہ ہونا چاہیے، جیسے جہاد، حج، عمرہ، طلب علم وغیرہ۔ ابن عمرؓ ابن مسعودؓ اور عطاء کا یہی فتویٰ ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کہتے ہیں کہ سفر کسی ایسے مقصد کے لیے ہونا چاہیے جو شرعاً جائز ہو، حرام و ناجائز اغراض کے لیے جو سفر کیا جائے اس میں قصر کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ قصر ہر سفر میں کیا جاسکتا ہے، رہی سفر کی نوعیت تو وہ بجائے خود ثواب یا عتاب کی استحقاق ہو سکتی ہے، مگر قصر کی اجازت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

بعض ائمہ نے "مضاائقہ نہیں" (فَلَيْسَ عَلَيْهِ جُنَاحٌ) کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ سفر میں قصر کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ محض اس کی اجازت ہے۔ آدمی چاہے تو اس سے فائدہ اٹھائے ورنہ پوری نماز پڑھے۔ یہی رائے امام شافعیؒ نے اختیار کی ہے اگرچہ وہ قصر کرنے کو افضل اور ترک قصر کو ترک ادنیٰ قرار دیتے ہیں۔ امام احمدؒ کے نزدیک قصر کرنا واجب تو نہیں ہے مگر نہ کرنا مکروہ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قصر کرنا واجب ہے اور یہی رائے ایک روایت میں امام مالکؒ سے بھی منقول ہے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ سفر میں قصر کیا ہے اور کسی مقبر روایت میں یہ منقول نہیں ہے کہ آپؐ نے کبھی سفر میں چار رکعتیں پڑھی ہوں۔ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ رضی اللہ عنہم کے ساتھ سفر میں رہا ہوں اور کبھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے قصر کیا ہو۔ اسی کی تائید میں ابن عباسؓ اور دوسرے متقدمہ صحابہ سے بھی مستند روایات منقول ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے جب حج کے موقع پر منیٰ میں چار رکعتیں پڑھائیں تو صحابہ نے اس پر اعتراض کیا اور حضرت عثمانؓ نے یہ جواب دے کر لوگوں کو مطمئن کیا کہ میں نے مکہ میں شادی کر لی ہے اور چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا ہے کہ جو شخص کسی شہر میں شادی کرے اور وہ گویا اس شہر کا باشندہ ہے، اس لیے میں نے یہاں قصر نہیں کیا۔ ان کثیر روایات کے خلاف دو روایتیں حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قصر اور اتمام دونوں درست ہیں لیکن یہ روایتیں سند کے اعتبار سے ضعیف ہونے کے علاوہ خود حضرت عائشہؓ ہی کے ثابت شدہ مسلک کے خلاف ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ایک حالت میں سفر واجب ہو جاتی ہے جس میں ایک ہی عارضی فرد و گاہ پر حسب موقع کبھی قصر اور کبھی اتمام دونوں کیے جاسکتے ہیں، اور غالباً حضرت عائشہؓ نے اسی حالت کے متعلق فرمایا ہو گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں قصر بھی کیا ہے اور اتمام بھی۔ رہے قرآن کے یہ الفاظ کہ "مضاائقہ نہیں" مگر قصر کرو، تو ان کی نظر سورۃ بقرہ رکوع ۹ میں گزر چکی ہے جہاں مضا اور مروہ کے درمیان سعی کے متعلق بھی یہی الفاظ فرمائے گئے ہیں، حالانکہ یہ سعی مناسک حج میں سے ہے اور واجب ہے۔ دراصل دونوں جگہ یہ کہنے کا مقصد لوگوں کے اس اندیشہ کو دور کرنا ہے کہ ایسا کرنے سے کہیں کوئی گناہ تو لازم نہیں آئے گا یا ثواب میں کمی تو نہ ہوگی۔

مقدار سفر جس میں قصر کیا جاسکتا ہے، ظاہریہ کے نزدیک کچھ نہیں ہے، ہر سفر میں قصر کیا جاسکتا ہے خواہ کم ہو یا زیادہ۔ امام مالکؒ کے نزدیک ۸ میل یا ایک دن رات سے کم کے سفر میں قصر نہیں ہے۔ یہی رائے امام احمدؒ کی ہے۔ ابن جراحؒ کا بھی یہی مسلک ہے اور امام شافعیؒ سے بھی ایک قول اس کی تائید میں مروی ہے۔ حضرت انسؓ ۱۵ میل کے سفر میں قصر کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ امام ابو حامیؒ اور امام زہریؒ حضرت عمرؓ کی اس رائے کو لیتے ہیں کہ ایک دن کا سفر قصر کے لیے کافی ہے۔ حسن بصریؒ دو دن

الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ طَافِئَةً مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلِيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ
فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِنْ وَرَائِكُمْ وَلْتَأْتِ طَافِئَةٌ أُخْرَى
لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلِيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ
وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَيُغْفَلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ

کھڑے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور اسلحہ لیے رہے، پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے اگر تمہارے ساتھ پڑھے اور وہ بھی چوکتا رہے اور اپنے اسلحہ لیے رہے، کیوں کہ کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو تو

۱۳۴ امام ابو یوسف اور حسن بن زیاد نے ان الفاظ سے یہ گمان کیا ہے کہ صلوٰۃ خوف صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے لیے مخصوص تھی۔ لیکن قرآن میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فطرب کر کے ایک حکم دیا گیا ہے اور وہی حکم آپ کے بعد آپ کے جانشینوں کے لیے بھی ہے۔ اس لیے صلوٰۃ خوف کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ پھر بکثرت جلیل القدر صحابہ سے ثابت ہے کہ انہوں نے حضور کے بعد بھی صلوٰۃ خوف پڑھی ہے اور اس باب میں کسی صحابی کا اختلاف مروی نہیں ہے۔

۱۳۵ صلوٰۃ خوف کا یہ حکم اس صورت کے لیے ہے جب کہ دشمن کے حملہ کا خطرہ تو ہو مگر عللاً معرکہ قتال گرم نہ ہو رہی یہ صورت کہ عللاً جنگ ہو رہی ہو تو اس صورت میں حنیفہ کے نزدیک نماز مؤخر کر دی جائے گی۔ امام مالک اور امام ثوری کے نزدیک اگر رکوع و سجود ممکن نہ ہو تو اشاروں سے پڑھ لی جائے۔ امام شافعی کے نزدیک نماز ہی کی حالت میں تھوڑی سی زبرد خور دہی کی جاسکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے کہ آپ نے غزوہ خندق کے موقع پر چار نمازیں نہیں پڑھیں اور پھر موقع پاکر علی الترتیب انہیں ادا کیا، حالانکہ غزوہ خندق سے پہلے صلوٰۃ خوف کا حکم آپ کا تھا۔

۱۳۶ صلوٰۃ خوف کی ترکیب کا انحصار بڑی حد تک جنگی حالات پر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حالات میں مختلف طریقوں سے نماز پڑھائی ہے اور امام وقت مجاز ہے کہ ان طریقوں میں سے جس طریقہ کی اجازت جنگی صورت حال دے اسی کو اختیار کرے۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ فوج کا ایک حصہ امام کے ساتھ نماز پڑھے اور دوسرا حصہ دشمن کے مقابلہ پر رہے۔ پھر جب ایک رکعت پوری ہو جائے تو پہلا حصہ سلام پھیر کر چلا جائے اور دوسرا حصہ اگر دوسری رکعت امام کے ساتھ پوری کرے۔ اس طرح

فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُمْ مَيْلَةً وَاحِدَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ
بِكُمْ أَذًى مِنْ مَطَرٍ أَوْ كُنْتُمْ مَرْضَى أَنْ تَضَعُوا
أَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ
عَذَابًا مُهِينًا ۝۱۳۲ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَادْكُرُوا اللَّهَ قِيَمًا

وہ تم پر یکساں رگی ٹوٹ پڑیں۔ البتہ اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو
تو اسلحہ رکھ دینے میں مضائقہ نہیں، مگر پھر بھی چوکے رہو۔ یقین رکھو کہ اللہ نے کافروں
کے لیے رُسوا کُن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے

امام کی دو رکعتیں ہوں گی اور فوج کی ایک ایک رکعت۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک حصہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھ کر چلا جائے، پھر دوسرا حصہ پھر ایک رکعت امام کے
پیچھے پڑھے، پھر دونوں حصے باری باری سے اگر اپنی چھوٹی ہوئی ایک ایک رکعت بطور خود ادا کریں۔ اس طرح دونوں حصوں
کی ایک ایک رکعت امام کے پیچھے ادا ہوگی، اور ایک رکعت انفرادی طور پر۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ امام کے پیچھے فوج کا ایک حصہ دو رکعتیں ادا کرے اور تشہد کے بعد سلام پھیر کر چلا جائے۔ پھر دوسرا حصہ
تیسری رکعت میں اگر شریک ہو اور امام کے ساتھ سلام پھیرے۔ اس طرح امام کی چار اور فوج کی دو دو رکعتیں ہوں گی۔

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ فوج کا ایک حصہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھے اور جب امام دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہو تو
متقدم بطور خود ایک رکعت مع تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیں۔ پھر دوسرا حصہ اگر اس حال میں امام کے پیچھے کھڑا ہو کہ ابھی امام دوسری
ہی رکعت میں ہو اور یہ لوگ بقیہ نماز امام کے ساتھ ادا کرنے کے بعد ایک رکعت خود اٹھ کر پڑھ لیں۔ اس صورت میں امام کو دوسری
رکعت میں طویل قیام کرنا ہوگا۔

پہلی صورت کو ابن عباس، جابر بن عبد اللہ اور مجاہد نے روایت کیا ہے۔ دوسرے طریقہ کو عبد اللہ بن مسعود نے روایت
کیا ہے اور حنفیہ اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ تیسرے طریقہ کو حسن بصری نے ابو بکرہ سے روایت کیا ہے۔ اور چوتھے طریقہ کو امام شافعی
اور مالک نے تھوڑے اختلاف کے ساتھ ترجیح دی ہے اور اس کا ماخذ سهل بن ابی حمزہ کی روایت ہے۔

ان کے علاوہ صلوة خوف کے اور بھی طریقے ہیں جن کی تفصیل مبسوطات میں مل سکتی ہے۔

۱۳۷ یعنی یہ احتیاط جس کا حکم نہیں دیا جا رہا ہے، محض دنیوی تدابیر کے لحاظ سے ہے، ورنہ دراصل فتح و شکست
کا مدار تقاری تدابیر پر نہیں بلکہ اللہ کے فیصلہ پر ہے۔ اس لیے ان احتیاطی تدبیروں پر عمل کرتے ہوئے تمہیں اس امر کا یقین رکھنا

وَتَعُوذًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ ۚ إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا ۝ وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ۚ إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ

اور بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو۔ اور جب اطمینان نصیب ہو جائے تو پوری نماز پڑھو۔ نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندی وقت کے ساتھ اہل ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔ اس گروہ کے تعاقب میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ اگر تم تکلیف اٹھا رہے ہو تو تمہاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ اور تم اللہ سے اُس چیز کے اُمیدوار ہو جس کے وہ اُمیدوار نہیں ہیں۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور وہ حکیم و دانا ہے ۛ

اُسے نبی! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہ راست اللہ نے چاہیے کہ جو لوگ اللہ کے نور کو اپنی پیچوں سے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں اللہ انہیں رسوا کرے گا۔

۱۳۸ یعنی گروہ کفار جو اس وقت اسلام کی دعوت اور نظام اسلامی کے قیام کی راہ میں مانع و مزاحم بن کر کھڑا ہوا تھا۔

۱۳۹ یعنی تعجب کا مقام ہے اگر اہل ایمان حق کی خاطر اتنی تکلیفیں بھی برداشت نہ کریں مبنی کفار باطل کی خاطر برداشت کر رہے ہیں، حالانکہ ان کے سامنے صرف دنیا اور اس کے ناپائیدار فائدے ہیں اور اس کے برعکس اہل ایمان رب السموات والارض کی خوشنودی و تقرب اور اس کے ابدی انعامات کے امیدوار ہیں۔

۱۴۰ اس رکوع اور اس کے بعد والے رکوع میں ایک اہم معاملہ سے بحث کی گئی ہے جو اسی زمانہ میں پیش آیا تھا۔ قصہ یہ ہے کہ انصار کے قبیلہ بنی ظفر میں ایک شخص طعمہ یا بشیر بن اُییرق تھا۔ اس نے ایک انصاری کی زرہ چرائی۔ اور جب اس کا جسم شروع ہوا تو مال مسروقہ ایک یہودی کے ہاں رکھ دیا۔ زرہ کے مالک نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کیا اور طعمہ پر چہا شبہ ظاہر کیا۔ مگر طعمہ اور اس کے بھائی بندوں اور بنی ظفر کے بہت سے لوگوں نے آپس میں اتفاق کر کے اُس یہودی پر الزام قویپ دیا۔ یہودی سے پوچھا گیا تو اس نے اپنی براءت ظاہر کی۔ لیکن یہ لوگ طعمہ کی حمایت میں زور شور سے دکالت کرتے

بِمَا أَرَادَكَ اللَّهُ وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِبِينَ خَصِيمًا ۝۱۰۰ وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ
إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝۱۰۱ وَلَا تَجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ
أَنْفُسَهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَانًا أَثِيمًا ۝۱۰۲ يَسْتَخْفُونَ

تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ تم بددیانت لوگوں کی طرف سے
جھگڑنے والے نہ بنو اور اللہ سے درگزر کی درخواست کرو وہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحیم
ہے۔ جو لوگ اپنے نفس سے خیانت کرتے ہیں تم ان کی حمایت نہ کرو۔ اللہ کو ایسا شخص پسند
نہیں ہے جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو۔ یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات

رہے اور کہا کہ یہ یہودی غیث جو حق کا انکار اور اللہ کے رسول سے کفر کرنے والا ہے اس کی بات کا کیا اعتبار بات ہماری تسلیم
کی جانی چاہیے کیونکہ ہم مسلمان ہیں۔ قریب تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس مقدمہ کی ظاہری روداد سے متاثر ہو کر اس یہودی کے
خلاف فیصلہ صادر فرما دیتے اور مستغیث کو بھی بنی امیہ قری پر الزام عائد کرنے پر تہیہ فرماتے۔ اتنے میں وحی آئی اور معاملہ کی ساری
حقیقت کھول دی گئی۔

اگرچہ ایک قاضی کی حیثیت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا روداد کے مطابق فیصلہ کر دینا بھائے خود آپ کے لیے کوئی
گناہ نہ ہوتا۔ اور ایسی صورتیں قاضیوں کو پیش آتی ہی ہیں کہ ان کے سامنے غلط روداد پیش کر کے حقیقت کے خلاف فیصلے حاصل
کر لیے جاتے ہیں۔ لیکن اُس وقت جبکہ اسلام اور کفر کے درمیان ایک زبردست کشمکش برپا تھی اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم روداد
مقدمہ کے مطابق یہودی کے خلاف فیصلہ صادر فرما دیتے تو اسلام کے مخالفوں کو آپ کے خلاف اور پوری اسلامی جماعت کو
خود دعوت اسلامی کے خلاف ایک زبردست اخلاقی حربہ مل جاتا۔ وہ یہ کہتے پھرتے کہ اجماعی یہاں حق و انصاف کا کیا سوال ہے
یہاں تو وہی جتھہ ہندی اور مصیبت کام کر رہی ہے جس کے خلاف تبلیغ کی جاتی ہے۔ اسی خطرے سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ
نے خاص طور پر اس مقدمہ میں مداخلت فرمائی۔

ان رکوعوں میں ایک طرف ان مسلمانوں کو سختی کے ساتھ علامت کی گئی ہے جنہوں نے محض خاندان اور قبیلہ کی مصیبت
میں مجرموں کی حمایت کی تھی۔ دوسری طرف عام مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ انصاف کے معاملہ میں کسی تعصب کا دخل نہ ہونا
چاہیے۔ یہ ہرگز دیانت نہیں ہے کہ اپنے گروہ کا آدمی اگر برسرِ باطل ہو تو اس کی بے جا حمایت کی جائے اور دوسرے گروہ کا آدمی
اگر برسرِ حق ہو تو اس کے ساتھ بے انصافی کی جائے۔

۱۴۱ جو شخص دوسرے کے ساتھ خیانت کرتا ہے وہ دراصل سب سے پہلے خود اپنے نفس کے ساتھ خیانت کرتا ہے۔
کیونکہ دل اور دماغ کی جو قوتیں اس کے پاس بطور امانت ہیں ان پر بے جا تعزیر کر کے وہ انہیں مجبور کرتا ہے کہ خیانت میں اس کا

مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُمْ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ
 مَا لَا يَرْضَى مِنَ الْقَوْلِ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ۝
 هَآئِنْتُمْ هَؤُلَاءِ جَدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُجَادِلُ اللَّهَ
 عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَمْ مَنْ يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ
 سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝
 وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُ عَلَى نَفْسِهِ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا
 حَكِيمًا ۝ وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ

چھپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے۔ وہ تو اُس وقت بھی اُن کے ساتھ ہوتا ہے
 جب یہ راتوں کو چھپ کر اُس کی مرضی کے خلاف مشورے کرتے ہیں۔ ان کے سارے
 اعمال پر اللہ محیط ہے۔ ہاں! تم لوگوں نے ان مجرموں کی طرف سے دنیا کی زندگی میں تو
 جھگڑا کر لیا، مگر قیامت کے روز ان کی طرف سے کون جھگڑا کرے گا؟ آخر وہاں کون ان کا
 وکیل ہوگا؟ اگر کوئی شخص بُرا فعل کر گزرے یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے اور اس کے بعد اللہ سے
 درگزر کی درخواست کرے تو اللہ کو درگزر کرنے والا اور رحیم پائے گا۔ مگر جو بُرائی کمالے تو
 اس کی یہ کمائی اُسی کے لیے وبال ہوگی، اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے اور وہ حکیم و دانہ ہے۔
 پھر جس نے کوئی خطا یا گناہ کر کے اس کا الزام کسی بے گناہ پر تھوپ دیا اُس نے تو

ساتھ دیں۔ اور اپنے ضمیر کو جسے اللہ نے اس کے اخلاق کا محافظ بنایا تھا، اس حد تک دبا دیتا ہے کہ وہ اس خیانت کاری میں
 مددراہ بننے کے قابل نہیں رہتا۔ جب انسان اپنے اندر اس خالاندہ دست برد کو پایہ تکمیل تک پہنچا لیتا ہے تب کمیں باہر
 اس سے خیانت و معیت کے افعال صادر ہوتے ہیں۔

أَحْمَلُ بُهْتَانًا وَإِنَّمَا مُبِينًا ۝۱۱۲ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ
 لَهَمَّتْ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ
 وَمَا يَضُرُّونَكَ مِنْ شَيْءٍ وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
 وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا ۝۱۱۳
 لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّنْ نُّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ
 أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ
 اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۝۱۱۴ وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ

بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا

اے نبی! اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی
 تو ان میں سے ایک گروہ نے تو تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا، حالاں کہ
 درحقیقت وہ خود اپنے سوا کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر رہے تھے اور تمہارا کوئی نقصان
 نہ کر سکتے تھے۔ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور تم کو وہ کچھ بتایا ہے جو تمہیں
 معلوم نہ تھا، اور اس کا فضل تم پر بہت ہے۔

لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر و بیشتر کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ ہاں اگر کوئی پوشیدہ
 طور پر صدقہ و خیرات کی تلقین کرے یا کسی نیک کام کے لیے یا لوگوں کے معاملات میں اصلاح
 کرنے کے لیے کسی سے کچھ کہے تو یہ البتہ بھلی بات ہے اور جو کوئی اللہ کی رضا جوئی کے لیے
 ایسا کرے گا اُسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے۔ مگر جو شخص رسول کی مخالفت پر کمر بستہ ہو اور

۱۱۲ یعنی اگر وہ غلط رواد پیش کر کے تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتے اور اپنے حق میں
 انصاف کے خلاف فیصلہ حاصل کر لیتے تو نقصان انہی کا تھا، تمہارا کچھ بھی نہ بگڑتا۔ کیونکہ خدا کے نزدیک مجرم وہ ہوتے نہ کہ تم۔



مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ
تُولَّاهُمْ مَا تَوَلَّىٰ وَلِصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝۱۱۵
يَغْفِرْ أَنْ يُّشْرَكَ بِهِ وَيَعْفِرْ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ ۖ وَمَنْ
يُّشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝۱۱۶
دُونَهُ إِلَّا لِنَاسٍ وَإِنْ يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيدًا ۝۱۱۷

اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے، درآں حالیکہ اس پر راہِ راست واضح ہو چکی ہو، تو اُس کو ہم اُسی طرف چلائیں گے جلدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔

اللہ کے ہاں بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے، اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا وہ تو گمراہی میں بہت دُور نکل گیا۔ وہ اللہ کو چھوڑ کر دیویوں کو معبود بناتے ہیں۔ وہ اُس باغی شیطان کو معبود بناتے ہیں

جو شخص حاکم کو دھوکا دے کر اپنے حق میں غلط فیصلہ حاصل کرتا ہے وہ دراصل خود اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرتا ہے کہ ان تدبیروں سے حق اس کے ساتھ ہو گیا، حالانکہ فی الواقع اللہ کے نزدیک حق جس کا ہے اسی کا رہتا ہے اور فریب خوردہ حاکم کے فیصلہ سے حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ (ملاحظہ ہو سورہ بقرہ حاشیہ نمبر ۱۹۷)۔

۱۱۳ جب مذکورہ بالا مقدمہ میں وحی الہی کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس خائن مسلمان کے خلاف اور اُس بے گناہ یہودی کے حق میں فیصلہ صادر فرمادیا تو اس منافق پر جاہلیت کا اس قدر سخت دُورہ پڑا کہ وہ مدینہ سے نکل کر اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے پاس کھچلا گیا اور کھلم کھلا مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ اس آیت میں اس کی اسی حرکت کی طرف اشارہ ہے۔

۱۱۴ اس روایت میں اوپر کے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ اپنی جاہلیت کے طیش میں اگر یہ شخص جس راہ کی طرف گیا ہے وہ کیسی راہ ہے، اور صالحین کے گروہ سے الگ ہو کر جن لوگوں کا ساتھ اس نے اختیار کیا ہے وہ کیسے لوگ ہیں۔

۱۱۵ شیطان کو اس معنی میں تو کوئی بھی معبود نہیں بنانا کہ اس کے آگے مراسمِ پرستش ادا کرتا ہو اور اس کو

لَعْنَةُ اللَّهِ وَقَالَ لَا تَخْذَنْ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا ۝
وَلَا ضَلَّةَ لَهُمْ وَلَا مَنِيَّةَ لَهُمْ وَلَا مَرْتَهُمْ فَلْيَبْتَكَنْ أَذَانَ الْأَنْعَامِ
وَلَا مَرْتَهُمْ فَلْيَغَيِّرْ خَلْقَ اللَّهِ وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ
وَلِيًّا مِّنْ دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِينًا ۝ يَعِدُهُمْ

جس کو اللہ نے لعنت زدہ کیا ہے۔ (وہ اس شیطان کی اطاعت کر رہے ہیں جس نے اللہ سے کہا تھا کہ میں تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ لے کر رہوں گا، میں انہیں بہکاوں گا، میں انہیں زندوں میں ابھادوں گا، میں انہیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے جانوروں کے کان پھاڑیں گے اور میں انہیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے خدائی ساخت میں ردوبدل کریں گے۔ اس شیطان کو جس نے اللہ کے بجائے اپنا ولی و سرپرست بنالیا وہ صریح نقصان میں پڑ گیا۔ وہ ان لوگوں سے وعدے کرتا ہے

الوہیت کا درجہ دیتا ہو۔ البتہ اُسے مہر و بنائے کی صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کی باگیں شیطان کے ہاتھ میں دیتا ہے اور جہر جہر وہ چلاتا ہے اُدھر چلتا ہے، گویا کہ یہ اُس کا بندہ ہے اور وہ اُس کا خدا۔ اس سے معلوم ہو کہ کسی کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت اور اندھی پیروی کرنے کا نام بھی عبادت ہے اور جو شخص اس طرح کی اطاعت کرتا ہے وہ دراصل اس کی عبادت بجالاتا ہے۔

۱۴۶ یعنی اُن کے اوقات میں، اُن کی محنتوں اور کوششوں میں، اُن کی قوتوں اور قابلیتوں میں، اُن کے مال اور اُن کی اولاد میں اپنا حصہ لگاؤں گا اور اُن کو قریب سے کرایا پارچاؤں گا کہ وہ ان ساری چیزوں کا ایک معتد بہ حصہ میری راہ میں صرف کریں گے۔

۱۴۷ اہل عرب کے توہمات میں سے ایک کی طرف اشارہ ہے۔ ان کے ہاں قاعدہ تھا کہ جب اُونٹنی پانچ یا سب سے بچے جن لیتی تو اس کے کان پھاڑ کر اسے اپنے دیوتا کے نام پر چھوڑ دیتے اور اس سے کام لینا حرام سمجھتے تھے۔ اسی طرح جس اُونٹ کے نطفہ سے دس بچے ہو جاتے اُسے بھی دیوتا کے نام پر چھوڑ دیتے اور اس سے کام لینا حرام سمجھتے تھے۔ اس بات کی علامت تھا کہ یہ چھوڑ دیا ہوا جانور ہے۔

۱۴۸ خدائی ساخت میں ردوبدل کرنے کا مطلب اشیاء کی پیدائشی بناوٹ میں ردوبدل کرنا نہیں ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ جانی جائے تب تو پوری انسانی تہذیب ہی شیطان کے اغواء کا نتیجہ قرار پائے گی۔ اس لیے کہ تہذیب تو نامری ان تعزات

وَيُؤَيِّنُكُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ۝ اُولَٰئِكَ
 مَا لَهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يُجَدُّونَ عَنْهَا فَحِصًّا ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا
 وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ
 خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ۝
 لَيْسَ بِأَمَانِيكُمْ وَلَا أَمَانِي أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا

اور انہیں اُمیدیں دلاتا ہے، مگر شیطان کے سارے وعدے بجز فریب کے اور کچھ نہیں ہیں۔ ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے جس سے خلاصی کی کوئی ضرورت یہ نہ پائیں گے۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں، تو انہیں ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنی بات میں سچا ہوگا۔

انجام کار نہ تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو بھی بُرائی کرے گا

کا ہے جو انسان خدا کی بنائی ہوئی چیزوں میں کرتا ہے۔ دراصل اس جگہ جس رد و بدل کو شیطان فعل قرار دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کسی چیز سے وہ کام لے جس کے لیے خدا نے اُسے پیدا نہیں کیا ہے اور کسی چیز سے وہ کام نہ لے جس کے لیے خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ تمام افعال جو انسان اپنی اور اشیاء کی فطرت کے خلاف کرتا ہے اور وہ تمام صورتیں جو وہ منشاء فطرت سے گریز کے لیے اختیار کرتا ہے اس آیت کی رو سے شیطان کی گمراہ کن تحریکات کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً عمل قرم و رط، ضبط و لاد، زہانیت، برہمچر، مردوں اور عورتوں کو بانجھ بنانا، مردوں کو خواہ سر ہانانا، عورتوں کو ان خدات سے خوف کرنا جو فطرت نے ان کے سپرد کی ہیں اور انہیں تمدن کے اُن شعبوں میں گھسیٹ لانا جن کے لیے مرد پیدا کیا گیا ہے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے بے شمار افعال جو شیطان کے شاگرد دنیا میں کر رہے ہیں اور اصل یہ معنی رکھتے ہیں کہ یہ لوگ خالق کائنات کے ٹھکانے ہوئے قوانین کو غلط سمجھتے ہیں اور ان میں اصلاح فرمانا چاہتے ہیں۔

۱۴۹ شیطان کا سارا کاروبار ہی وعدوں اور اُمیدوں کے بل پر چلتا ہے۔ وہ انسان کو انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر جب کسی غلط راستے کی طرف لے جانا چاہتا ہے تو اس کے آگے ایک سبز باغ پیش کر دیتا ہے کسی کو انفرادی نطف و لذت اور کامیابیوں کی امید کسی کو قومی سر بلندیوں کی توقع کسی کو نوع انسانی کی فلاح و بہبود کا یقین کسی کو صداقت تک

يُجْزِيهِ ۖ وَلَا يَجْدَلُ ۚ مَنْ دُونَ اللَّهِ وَلِيًّا ۚ وَلَا نَصِيرًا ۝ وَمَنْ
يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ
فَاُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا ۝ وَمَنْ أَحْسَنُ
دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ
إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا ۝ وَلِلَّهِ مَا
فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ
مُّحِيطًا ۝ وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ ۚ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ ۚ

اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلہ میں اپنے لیے کوئی حامی و مددگار نہ پاسکے گا۔ اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔ اُس شخص سے بہتر اور کس کا طریق زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے ہر تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویہ نیک رکھا اور یکسو ہو کر براہیم کے طریقے کی پیروی کی، اُس ابراہیم کے طریقے کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنالیا تھا۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے اور اللہ ہر چیز پر محیط ہے ۝

لوگ تم سے عورتوں کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ تمہیں ان کے معاملہ میں فتویٰ دیتا ہے،

پہنچ جانے کا اطمینان کسی کو یہ بھروسہ کہ نہ خدا ہے نہ آخرت، بس مکر مٹی ہو جانا ہے کسی کو یہ تسلی کہ آخرت ہے بھی تو وہاں کی گرفت سے فلاں کے طفیل اور فلاں کے صدقے میں بچ نکلو گے۔ غرض جو جس وعدے اور جس توقع سے قریب کھا سکتا ہے اس کے سامنے وہی پیش کرتا ہے اور پھانس لیتا ہے۔

۱۵۰۔ یعنی اللہ کے آگے ہر تسلیم خم کر دینا اور خود سری و خود مختاری سے باز آ جانا اس لیے بہترین طریقہ ہے کہ یہ حقیقت کے عین مطابق ہے۔ جب اللہ زمین و آسمان کا اور ان ساری چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں تو انسان کے لیے صحیح رویہ یہی ہے کہ اس کی بندگی و اطاعت پر راضی ہو جائے اور سرکشی چھوڑ دے۔

وَمَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ فِي يَتِمَّى النِّسَاءَ الَّتِي لَا تَوْلُونَهُنَّ
مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ
الْوِلْدَانِ وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ

اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سنائے جا چکے ہیں یعنی وہ احکام جو
اُن یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں جن کے حق تم ادا نہیں کرتے اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو یا لالچ
کی بنا پر تم خود ان سے نکاح کر لینا چاہتے ہو اور وہ احکام جو اُن بچوں کے متعلق ہیں جو بیچارے کوئی
زور نہیں رکھتے۔ اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو، اور جو بھلائی تم کرو گے

۱۵۱ یعنی اگر انسان اللہ کے آگے سر تسلیم خم نہ کرے اور سرکشی سے باز نہ آئے تو وہ اللہ کی گرفت سے بچ کر
کیسے بھاگ نہیں سکتا، اللہ کی قدرت اس کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

۱۵۲ اس کی تفسیر میں فرمائی گئی کہ عورتوں کے معاملہ میں لوگ کیا پوچھتے تھے۔ مگر آگے چل کر جو فتویٰ دیا گیا ہے
اس سے سوال کی نوعیت خود واضح ہو جاتی ہے۔

۱۵۳ یہ اصل استفتاء کا جواب نہیں ہے بلکہ لوگوں کے سوال کی طرف توجہ فرمانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اُن احکام
کی پابندی پر پھر ایک مرتبہ زور دیا ہے جو اسی سورۃ کے آغاز میں یتیم لڑکیوں کے متعلق بالخصوص اور یتیم بچوں کے متعلق بالعموم
ارشاد فرمائے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں یتیموں کے حقوق کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ ابتدائی دور کو عورتوں میں
ان کے حقوق کے تحفظ کی تاکید بڑی شدت کے ساتھ کی جا چکی تھی۔ مگر اس پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ اب جو معاشرتی مسائل کی گفتگو
پھر مڑی تو قبل اس کے کہ لوگوں کے پیش کردہ سوال کا جواب دیا جاتا، یتیموں کے مفاد کا ذکر بطور خود بھیڑ دیا گیا۔

۱۵۴ اشارہ ہے اس آیت کی طرف جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ”اگر یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے
ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں....“ (سورۃ نساء۔ آیت ۳)

۱۵۵ تَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”تم ان سے نکاح کرنے کی رغبت رکھتے ہو“ اور یہ
بھی ہو سکتا ہے کہ ”تم ان سے نکاح کو ناپسند نہیں کرتے“۔ حضرت عائشہ اس کی تشریح میں فرماتی ہیں کہ جن لوگوں کی سرپرستی میں ایسی
یتیم لڑکیاں ہوتی تھیں جن کے پاس والدین کی چھوڑی ہوئی کچھ دولت ہوتی تھی وہ ان لڑکیوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ظلم
کرتے تھے۔ اگر لڑکی بالدار ہونے کے ساتھ خوبصورت بھی ہوتی تو یہ لوگ چاہتے تھے کہ خود اس سے نکاح کر لیں اور مردانہ ادا
کیے بغیر اس کے مال اور جمال دونوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اگر وہ بد صورت ہوتی تو یہ لوگ نہ اس سے خود نکاح کرتے تھے اور
نہ کسی دوسرے سے اس کا نکاح ہونے دیتے تھے تاکہ اس کا کوئی ایسا سردھر پیدا نہ ہو جائے جو کل اس کے حق کا مطالبہ

فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِهِ عَلِيمًا ۝ وَإِنْ أُمْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا
 نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا
 وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ وَإِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا

وہ اللہ کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی۔

جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخصی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر میاں
 اور بیوی (کچھ حقوق کی کمی بیشی پر) آپس میں صلح کریں۔ صلح بہر حال بہتر ہے۔ نفس تنگ دلی کی
 طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں، لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو

کرنے والا ہو۔

۱۵۶ اشارہ ہے ان احکام کی طرف جو اسی سورہ کے پہلے اور دوسرے رکوع میں تینوں کے حقوق کے متعلق

ارشاد ہوئے ہیں۔

۱۵۷ یہاں سے اہل استفتاء کا جواب شروع ہوتا ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے سوال
 کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ زمانہ جاہلیت میں ایک شخص غیر محدود تعداد تک بیویاں کرنے کے لیے آزاد تھا اور ان کی تعداد
 بیویوں کے لیے کچھ بھی حقوق مقرر نہ تھے۔ سورہ نساء کی ابتدائی آیات جب نازل ہوئیں تو اس آزادی پر دو قسم کی پابندیاں عائد
 ہو گئیں۔ ایک یہ کہ بیویوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار تک محدود کر دی گئی۔ دوسرے یہ کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے
 کے لیے عدل (یعنی مساویانہ برتاؤ) کو شرط قرار دیا گیا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کسی شخص کی بیوی بائیس ہے، یا دائم المرض ہے
 یا تعلق زن و شو کے قابل نہیں رہی ہے اور شوہر دوسری بیوی بیاہ لاتا ہے تو کیا وہ مجبور ہے کہ دونوں کے ساتھ یکساں رغبت رکھے؟
 یکساں محبت رکھے؟ جسمانی تعلق میں بھی یکساں برتے؟ اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو کیا عدل کی شرط کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسری
 شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی کو چھوڑ دے؟ نیز یہ کہ اگر پہلی بیوی خود جلد نہ ہونا چاہے تو کیا زوجین میں اس قسم کا معاملہ ہو سکتا
 ہے کہ جو بیوی غیر مرغوب ہو چکی ہے وہ اپنے بعض حقوق سے خود دست بردار ہو کر شوہر کو طلاق سے باز رہنے پر راضی کر لے؟
 کیا ایسا کرنا عدل کی شرط کے خلاف تو نہ ہوگا؟ یہ سوالات ہیں جن کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے۔

۱۵۸ یعنی طلاق و جدائی سے بہتر ہے کہ اس طرح باہم مصالحت کر کے ایک عورت اسی شوہر کے ساتھ رہے جس کے

ساتھ وہ عمر کا ایک حصہ گزار چکی ہے۔

۱۵۹ عورت کی طرف سے تنگ دلی یہ ہے کہ وہ اپنے اندر شوہر کے لیے بے رغبتی کے اسباب کو خود محسوس

کرتی ہو اور پھر بھی وہ سلوک چاہے جو ایک مرغوب بیوی کے ساتھ ہی برتا جا سکتا ہے۔ مرد کی طرف سے تنگ دلی یہ ہے کہ

فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝ وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمِيلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ

یقین رکھو کہ اللہ تمہارے اس طرز عمل سے بے خبر نہ ہوگا۔ بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ لہذا قانون الہی کا منشا پورا کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو اُدھر لٹکتا چھوڑ دو۔ اگر تم اپنا طرز عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ جو عورت دل سے اتر جانے پر بھی اس کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہو اس کو وہ حد سے زیادہ دہانے کی کوشش کرے اور اس کے حقوق ناقابل برداشت حد تک گھٹا دینا چاہے۔

۱۶۰۔ یہاں پھر اللہ تعالیٰ نے مرد ہی کے جذبہ فیاضی سے اپیل کی ہے جس طرح بالعموم ایسے معاملات میں اس کا قاعدہ ہے۔ اس نے مرد کو ترغیب دی ہے کہ وہ بے رغبتی کے باوجود اس عورت کے ساتھ احسان سے پیش آئے جو برسوں اس کی رفیق زندگی رہی ہے اور اس خدا سے ڈرے جو اگر کسی انسان کی خامیوں کے سبب اپنی نظر اتفاقات اس سے پھیرے اور اس کے نصیب میں کمی کرنے پر تڑپے تو پھر اس کا دنیا میں کہیں ٹھکانا نہ رہے۔

۱۶۱۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی تمام حالات میں تمام حیثیتوں سے دو یا زائد بیویوں کے درمیان مساوات نہیں برت سکتا۔ ایک خوبصورت ہے اور دوسری بد صورت، ایک جوان ہے اور دوسری سن رسیدہ، ایک دائم المرضی ہے اور دوسری تندرست، ایک بدن مزاج ہے اور دوسری خوش مزاج، اور اسی طرح کے دوسرے تفاوت بھی ممکن ہیں جن کی وجہ سے ایک بیوی کی طرف طبعاً آدمی کی رغبت کم اور دوسری کی طرف زیادہ ہو سکتی ہے۔ ایسی حالتوں میں قانون یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ محبت و رغبت اور جہانی تعلق میں ضرور ہی دونوں کے درمیان مساوات رکھی جائے۔ بلکہ صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جب تم بے رغبتی کے باوجود ایک عورت کو طلاق نہیں دیتے اور اس کو اپنی خواہش یا خود اس کی خواہش کی بنا پر بیوی بنانے رکھتے ہو تو اس سے کم از کم اس حد تک تعلق ضرور رکھو کہ وہ عملاً بے شوہر ہو کر نہ رہ جائے۔ ایسے حالات میں ایک بیوی کی نسبت دوسری کی طرف میلان زیادہ ہونا تو فطری امر ہے لیکن ایسا بھی نہ ہونا چاہیے کہ دوسری یوں ملحق ہو جائے گویا کہ اس کا کوئی شوہر نہیں ہے۔

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن ایک طرف عدل کی شرط کے ساتھ تعدد ازواج کی اجازت دیتا ہے اور دوسری طرف عدل کو ناممکن قرار دے کر اس اجازت کو عملاً منسوخ کر دیتا ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نتیجہ نکالنے کے لیے اس آیت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا گیا ہوتا کہ ”تم عورتوں کے درمیان عدل نہیں کر سکتے“ تو

غَفُورًا رَحِيمًا ۱۲۹ ﴿وَلَنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهِ ۖ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا ۱۳۰﴾ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۖ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنِ اتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَلَئِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَنِيًّا حَمِيدًا ۱۳۱ ﴿وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا ۱۳۲﴾ إِنَّ يَشَآئِدُ هَبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِالْآخِرِينَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ قَدِيرًا ۱۳۳ ﴿

چشم پوشی کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ لیکن اگر دو میں ایک دوسرے سے الگ ہی ہو جائیں تو اللہ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ کا دامن بہت کشادہ ہے اور وہ دانا و مینا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ تم سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی تھی انہیں بھی یہی ہدایت کی تھی اور اب تم کو بھی یہی ہدایت کرتے ہیں کہ خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو۔ لیکن اگر تم نہیں مانتے تو نہ مانو، آسمان و زمین کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہی ہے اور وہ بے نیاز ہے ہر تعریف کا مستحق۔ ہاں اللہ ہی مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اور کار سازی کے لیے بس وہی کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو ہٹا کر تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے اور وہ اس کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ جو شخص

یہ نتیجہ نکالا جاسکتا تھا، مگر اس کے بعد ہی جو یہ فرمایا گیا کہ ”لہذا ایک یورپی کی طرف بالکل نہ جھک پڑو“ اس فقرے نے کوئی موقع اس مطلب کے لیے باقی نہیں چھوڑا جو کسی یورپ کی تقلید کرنے والے حضرات اس سے نکالنا چاہتے ہیں۔

۱۶۲ یعنی اگر حتی الامکان تم قصداً ظلم نہ کرو اور انصاف ہی سے کام لینے کی کوشش کرتے رہو تو فطری مجبوریوں کی بنا پر جو تھوڑی بہت کوتاہیاں تم سے انصاف کے معاملہ میں صادر ہوں گی انہیں اللہ معاف فرما دے گا۔



كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ
وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا
قَوِّمِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدِينَ

محض ثواب دنیا کا طالب ہو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے پاس ثواب دنیا بھی ہے اور
ثواب آخرت بھی، اور اللہ سمیع و بصیر ہے ۱۶۳

لے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے
انصاف اور تمہاری گواہی کی زبرد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے الدین اور رشتہ داروں پر

۱۶۳ ہاں ہم قانونی احکام بیان کرنے کے بعد اور بالخصوص تمدن و معاشرت کے ان پہلوؤں کی اصلاح پر
زور دینے کے بعد جن میں انسان اکثر ظلم کا ارتکاب کرتا رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس قسم کے چند پڑاثر جملوں میں ایک مختصر وعظ
ضرور فرمایا کرتا ہے اور اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ نفوس کو ان احکام کی پابندی پر آمادہ کیا جائے۔ اوپر چونکہ عورتوں کو
تیم بچوں کے ساتھ انصاف اور حسن سلوک کی ہدایت کی گئی ہے لہذا اس کے بعد ضروری سمجھا گیا کہ چند باتیں اہل ایمان کے
ذہن نشین کر دی جائیں :

ایک یہ کہ تم کبھی اس بھلاوے میں نہ رہنا کہ کسی کی قسمت کا بنانا اور بگاڑنا تمہارے ہاتھ میں ہے، اگر تم اُس سے ہاتھ
کھینچ لو گے تو اس کا کوئی ٹھکانہ نہ رہے گا۔ نہیں، تمہاری اور اس کی سب کی قسمتوں کا مالک اللہ ہے اور اللہ کے پاس اپنے
کسی بندے یا بندی کی مدد کا ایک تم ہی واحد ذریعہ نہیں ہو۔ اس مالک زمین و آسمان کے ذرائع بے حد وسیع ہیں اور
وہ اپنے ذرائع سے کام لینے کی حکمت بھی رکھتا ہے۔

دوسرے یہ کہ تمہیں اور تمہاری طرح پچھلے تمام انبیاء کی امتوں کو ہمیشہ یہی ہدایت کی جاتی رہی ہے کہ خدا ترسی کے
ساتھ کام کرو۔ اس ہدایت کی پیروی میں تمہاری اپنی فلاح ہے، خدا کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تم اس کی خلافت ورزی کرو گے تو
پچھلے تمام امتوں نے نافرمانیاں کر کے خدا کا کیا بگاڑ لیا ہے جو تم بگاڑ سکو گے۔ اُس فرمانروائے کائنات کو نہ پچھلے کسی کی پڑا
تھی نہ اب تمہاری پروا ہے۔ اس کے امر سے انحراف کرو گے تو وہ تم کو ہٹا کر کسی دوسری قوم کو سر بلند کرے گا اور تمہارا
ہٹ جانے سے اس کی سلطنت کی رونق میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

تیسرے یہ کہ خدا کے پاس دنیا کے فائدے بھی ہیں اور آخرت کے فائدے بھی، عارضی اور وقتی فائدے بھی
ہیں، پائیدار اور دائمی فائدے بھی۔ اب یہ تمہارے اپنے ظرف اور حوصلے اور ہمت کی بات ہے کہ تم اُس سے کس قسم کے

وَالْأَقْرَبِينَ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أُولَىٰ بِمَا تُفْعَلُونَ
فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا وَإِنْ تَلَوْا أَوْ تَعْرِضُوا
فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١٣٥﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا
آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ

ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریقِ معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ اُن کا خیر خواہ ہے۔ لہذا اپنی
خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے کئی لپی بات کسی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان
رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل
فائدے چاہتے ہو۔ اگر تم محض دنیا کے چند روزہ فائدوں ہی پر دیکھتے ہو اور ان کی خاطر ابدی زندگی کے فائدوں کو قربان
کر دینے کے لیے تیار ہو تو خدا ہی کچھ تم کو نہیں اور ابھی دسے دسے گا، مگر پھر آخرت کے ابدی فائدوں میں تمہارا کوئی حصہ
نہ رہے گا۔ دریا تو تمہاری کھیتی کو ابد تک سیراب کرنے کے لیے تیار ہے مگر یہ تمہارے اپنے ظرف کی تنگی اور حوصلہ کی پستی
ہے کہ صرف ایک فصل کی سیرابی کو ابدی خشک سالی کی قیمت پر خریدتے ہو۔ کچھ ظرف میں دسعت ہو تو اطاعت و بندگی کا وہ ثمر
اختیار کرو جس سے دنیا اور آخرت دونوں کے فائدے تمہارے حصہ میں آئیں۔

آخر میں فرمایا اللہ سمیع و بصیر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اندھا اور بہرا نہیں ہے کہ کسی شاہ بے خبر کی طرح
اندھا دھند کام کرے اور اپنی عطا و بخشش میں جھلے اور بُرے کے درمیان کوئی تمیز نہ کرے۔ وہ پوری باخبری کے ساتھ اپنی
اس کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ ہر ایک کے ظرف اور حوصلے پر اس کی نگاہ ہے۔ ہر ایک کے اوصاف کو وہ جانتا ہے۔
اُسے خوب معلوم ہے کہ تم میں سے کون کس راہ میں اپنی غفیتیں اور کوششیں صرف کر رہا ہے۔ تم اس کی نافرمانی کا راستہ اختیار
کر کے ان بخششوں کی اُمید نہیں کر سکتے جو اس نے صرف فرماں برداروں ہی کے لیے مخصوص کی ہیں۔

۱۶۴ یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا کہ انصاف کی روش پر چلو، بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے علمبردار بنو۔ تمہارا کام
صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا بھنڈا لے کر اٹھنا ہے۔ تمہیں اس بات پر کمر بستہ ہونا چاہیے کہ ظلم مٹے
اور اس کی جگہ عدل و راستی قائم ہو۔ عدل کو اپنے قیام کے لیے جس سہارے کی ضرورت ہے، مومن ہونے کی حیثیت سے
تمہارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم بنو۔

۱۶۵ یعنی تمہاری گواہی محض خدا کے لیے ہونی چاہیے، کسی کی روایت اس میں نہ ہو، کوئی ذاتی مفاد یا

وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ
وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝
إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ أَرَادُوا
كَفْرًا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا ۝

کی ہے اور ہر اس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے۔ جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور
اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روزِ آخرت سے کفر کیا وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور
بھٹ گیا۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر اپنے کفر میں
بڑھتے چلتے گئے، تو اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا اور نہ کبھی ان کو راہِ راست دکھائے گا۔
خدا کے سوا کسی کی خوشنودی تمہارے لئے نظر نہ ہو۔

۱۶۶ ایمان لانے والوں سے کہنا کہ ایمان لاؤ بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن دراصل یہاں لفظ ایمان دو الگ
معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایمان لانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ آدمی انکار کے بجائے اقرار کی راہ اختیار کرے، نہ ماننے
والوں سے الگ ہو کر ماننے والوں میں شامل ہو جائے۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس چیز کو مانے اُسے
سچے دل سے مانے۔ پوری بیخودگی اور غلوں کے ساتھ مانے۔ اپنی فکر کو، اپنے مذاق کو، اپنی پسند کو، اپنے رویے اور چلن کو
اپنی دوستی اور دشمنی کو، اپنی سنی و جہد کے معارف کو بالکل اُس عقیدے کے مطابق بنائے جس پر وہ ایمان لایا ہے۔ آیت میں
خطاب اُن تمام مسلمانوں سے ہے جو پہلے معنی کے لحاظ سے "ماننے والوں" میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان سے مطالبہ یہ کیا گیا
ہے کہ دوسرے معنی کے لحاظ سے سچے مومن بنیں۔

۱۶۷ کفر کرنے کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی صاف صاف انکار کر دے۔ دوسرے یہ کہ زبان سے تو
ماننے گردل سے نہ مانے، یا اپنے رویے سے ثابت کر دے کہ وہ جس چیز کو ماننے کا دعویٰ کر رہا ہے فی الواقع اسے نہیں
مانتا۔ یہاں کفر سے یہ دونوں معنی مراد ہیں اور آیت کا مقصود لوگوں کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ اسلام کے ان اساسی عقیدوں
کے ساتھ کفر کی ان دونوں اقسام میں سے جس قسم کا بڑا و بھی آدمی اختیار کرے گا، اس کا نتیجہ حق سے دوری اور باطل کی
راہوں میں سرگشتگی و نامرادی کے سوا کچھ نہ ہو گا۔

۱۶۸ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لیے دینِ محض ایک غیر بیخودہ تفریح ہے۔ ایک کھلونا ہے جس سے
وہ اپنے تخیلات یا اپنی خواہشات کے مطابق کھیلتے رہتے ہیں۔ جب نصائے دماغی میں ایک لہر اٹھی، مسلمان ہو گئے اور

بَشِّرِ الْمُنَافِقِينَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝۱۳۸ الَّذِينَ
يَتَّخِذُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ أَبِيتَغُونَ
عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۝۱۳۹ وَقَدْ نَزَّلَ
عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ
يُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ
غَيْرِهِ ۚ إِنَّكُمْ إِذًا مِثْلُهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِينَ

اور جو منافق اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں انہیں یہ مژدہ ملے گا کہ ان کے لیے
دردناک سزا تیار ہے۔ کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری
کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔ اللہ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ
اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے ہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی
دوسری بات میں نہ لگ جائیں۔ اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہی کی طرح ہو۔ یقین جانو کہ اللہ منافقوں اور

جب دوسری لڑائی کا فرین گئے۔ یا جب فائدہ مسلمان بن جانے میں نظر آیا، مسلمان بن گئے اور جب مجبور و منفعت نے
دوسری طرف جلوہ دکھایا تو اس کی پوجا کرنے کے لیے بے تکلف اسی طرف چلے گئے۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ کے پاس
نہ مغفرت ہے نہ ہدایت۔ اور یہ جو فرمایا کہ ”پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے“ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص محض کافر
بن جانے ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کے بعد دوسرے لوگوں کو بھی اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرے، اسلام کے خلاف
خفیہ سازشیں اور علانیہ تدبیریں شروع کر دے اور اپنی قوت اس سعی و جہد میں صرف کرنے لگے کہ کفر کا بول بالا ہو اور اس کے
مقابلہ میں اللہ کے دین کا جھنڈا سرنگوں ہو جائے۔ یہ کفر میں مزید ترقی اور ایک جرم پر پے درپے جرائم کا اضافہ ہے جس کا
دوبال بھی مجز و کفر سے لازماً زیادہ ہونا چاہیے۔

۱۶۹ ”عزت“ کا مفہوم عربی زبان میں اُردو کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہے۔ اُردو میں عزت محض احترام اور
قدردنیزت کے معنی میں آتا ہے۔ مگر عربی میں عزت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی بلند اور محفوظ حیثیت حاصل ہو جائے کہ
کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ دوسرے الفاظ میں لفظ عزت ”نا قابلِ تنگِ حرمت“ کا ہم معنی ہے۔

وَالْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا ۝ الَّذِينَ يَتَرَبَّصُونَ بِكُمْ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللَّهِ قَالُوا أَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَإِنْ كَانَ لِلْكَافِرِينَ نَصِيبٌ قَالُوا أَلَمْ نَسْتَعِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعَكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ۖ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ۝ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَدِّعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۖ وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ يُرَاءَوْنَ النَّاسَ وَلَا يُدْكَرُونَ اللَّهَ إِلَّا

کافروں کو جہنم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے۔ یہ منافق تمہارے معاملہ میں انتظار کر رہے ہیں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے فتح تمہاری ہوئی تو اگر کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اگر کافروں کا پلہ بھاری رہا تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے؟ پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا؟ بس اللہ ہی تمہارے اور ان کے معاملہ کا فیصلہ قیامت کے روز کرے گا اور (اس فیصلہ میں) اللہ نے کافروں کے لیے مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔

یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ جب نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو گھسٹاتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہیا

نہ یعنی اگر ایک شخص اسلام کا دعویٰ رکھنے کے باوجود کافروں کی ان مصیبتوں میں شریک ہوتا ہے جہاں آیات الہی کے خلاف کفر بجا جاتا ہے، اور ٹھنڈے دل سے ان لوگوں کو خدا اور رسول کا مذاق اڑاتے ہوئے سنتا ہے تو اس میں ان کافروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ (جس حکم کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے وہ سورہٴ انعام آیت ۸ میں بیان ہوا ہے)۔
۱۷ ہر زمانہ کے منافقین کی یہی خصوصیت ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو فائدے حاصل کیے جاسکتے ہیں ان کو یہ اپنے زبانی اقرار اور دائرۃ اسلام میں برائے نام شمولیت کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں۔ اور جو فائدے کافر

قَلِيلًا ۱۳۲ مَذْبَذَيْنَ بَيْنَ ذَلِكَ لَا إِلَى هَؤُلَاءِ وَلَا
إِلَى هَؤُلَاءِ وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا ۱۳۳

یاد کرتے ہیں۔ کفر و ایمان کے درمیان ڈانوا ڈول ہیں۔ نہ پورے اس طرف ہیں نہ پورے اس طرف۔ جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو اس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پاسکتے۔

ہونے کی حیثیت سے حاصل ہونے ممکن ہیں ان کی خاطر یہ کفار سے جا کر ملتے ہیں اور ہر طریقہ سے ان کو یقین دلاتے ہیں کہ تم کوئی "متعصب مسلمان" نہیں ہیں، نام کا تعلق مسلمانوں سے ضرور ہے مگر ہماری دلچسپیاں اور وفاداریاں تمہارے ساتھ ہیں، فکر و تہذیب اور مذاق کے لحاظ سے ہر طرح کی موافقت تمہارے ساتھ ہے، اور کفر و اسلام کی کشمکش میں ہمارا وزن جب پڑے گا تمہارے ہی پڑے میں پڑے گا۔

۱۳۲ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی شخص مسلمانوں کی جماعت میں شمار ہی نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ نماز کا پابند نہ ہو۔ جس طرح تمام ذمیوی جماعتیں اور مجلسیں اپنے اجتماعات میں کسی ممبر کے بلاغذر شریک نہ ہونے کو اس کی عدم دلچسپی پر محسوس کرتی ہیں اور مسلسل چند اجتماعات سے غیر حاضر رہنے پر اسے ممبری سے خارج کر دیتی ہیں اسی طرح اسلامی جماعت کے کسی مرن کا نماز باجماعت سے غیر حاضر رہنا اُس زمانے میں اس بات کی صریح دلیل سمجھا جاتا تھا کہ وہ شخص اسلام کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، اور اگر وہ مسلسل چند جماعت سے غیر حاضر رہتا تو یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اس بنا پر سخت سے سخت منافقوں کو بھی اس زمانے میں پانچوں وقت مسجد کی حاضری ضرور دینی پڑتی تھی کیونکہ اس کے بغیر وہ مسلمانوں کی جماعت میں شمار کیے ہی نہ جاسکتے تھے۔ البتہ جو چیز ان کو سچے اہل ایمان سے میسر کرتی تھی وہ یہ تھی کہ سچے مومن ذوق و شوق سے آتے تھے، وقت سے پہلے مسجدوں میں پہنچ جاتے تھے، نماز سے فارغ ہو کر بھی مسجدوں میں ٹھہرے رہتے تھے، اور ان کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ نماز سے ان کو حقیقی دلچسپی ہے۔ بخلاف اس کے اذان کی آواز سننے ہی منافق کی جان پر ہن جاتی تھی، دل پر جبر کر کے اُٹھتا تھا، اس کے آنے کا انداز صاف غمازی کرتا تھا کہ آئیں رہا بلکہ اپنے آپ کو کھینچ کر لارہا ہے، جماعت ختم ہوتے ہی اس طرح بھاگتا تھا گویا کسی قیدی کو رہائی ملی ہے، اور اس کی تمام حرکات سکناات سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص خدا کے ذکر سے کوئی رغبت نہیں رکھتا۔

۱۳۳ یعنی جس نے خدا کے کلام اور اس کے رسول کی سیرت سے ہدایت نہ پائی ہو، جس کو سچائی سے منحرف اور باطل پرستی کی طرف راغب دیکھ کر خدا نے بھی اسی طرف پھیر دیا ہو جس طرف وہ خود پھرنے چاہتا تھا، اور جس کی ضلالت طلبی کی وجہ سے خدا نے اس پر ہدایت کے دروازے بند اور صرف ضلالت ہی کے راستے کھول دیے ہوں، ایسے شخص کو راہ راست دکھانا درحقیقت کسی انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ اس معاملہ کو رزق کی مثال سے سمجھیے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رزق کے تمام خزانے اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ جس انسان کو جو کچھ بھی ملتا ہے اللہ ہی کے ہاں سے ملتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ
الْمُؤْمِنِينَ أَتُرِيدُونَ أَنْ تَجْعَلُوا لِلَّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا
مُبِينًا ۝۳۳ إِنَّ السُّفْقَيْنَ فِي الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ
وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا ۝۳۴ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے
خلاف صریح حجت دے دو؟ یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نیچے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو
ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔ البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں
مگر اللہ ہر شخص کو رزق اس راستہ سے دیتا ہے جس راستے سے وہ خود مانگتا ہو۔ اگر کوئی شخص اپنا رزق حلال راستہ
سے طلب کرے اور اسی کے لیے کوشش بھی کرے تو اللہ اس کے لیے حلال راستوں کو کھول دیتا ہے اور جتنی اس کی
نیت صادق ہوتی ہے اُسی نسبت سے حرام کے راستے اس کے لیے بند کر دیتا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص حرام خوراک
پر ٹٹا ہوا ہوتا ہے اور اسی کے لیے سہی کرتا ہے اس کو خدا کے اذن سے حرام ہی کی روٹی ملتی ہے اور پھر یہ کسی کے بس
کی بات نہیں کہ اس کے نصیب میں رزق حلال کھ دے۔ بالکل اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا میں منکر و مل کی تمام
راہیں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ کوئی شخص کسی راہ پر بھی اللہ کے اذن اور اس کی توفیق کے بغیر نہیں چل سکتا۔ یہی
یہ بات کہ کس انسان کو کس راہ پر چلنے کا اذن ملتا ہے اور کس راہ کی رہروی کے اسباب اس کے لیے ہمارے جاتے
ہیں، تو اس کا انحصار سراسر آدمی کی اپنی طلب اور سعی پر ہے۔ اگر وہ خدا سے لگاؤ رکھتا ہے، سچائی کا طالب ہے اور
خالص نیت سے خدا کے راستے پر چلنے کی سعی کرتا ہے تو اللہ اسی کا اذن اور اسی کی توفیق اسے عطا فرماتا ہے اور اسی
راہ پر چلنے کے اسباب اس کے لیے موافق کر دیتا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص خود گمراہی کو پسند کرتا ہے اور غلط
راستوں ہی پر چلنے کی سعی کرتا ہے، اللہ کی طرف سے اس کے لیے ہدایت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہی
راہیں اس کے لیے کھول دی جاتی ہیں جن کو اس نے آپ اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ ایسے شخص کو غلط سوچنے، غلط کام
کرنے اور غلط راہوں میں اپنی قوتیں صرف کرنے سے بچا لینا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ اپنے نصیب کی راہ
راست جس نے خود کھودی اور جس سے اللہ نے اس کو محروم کر دیا اس کے لیے یہ گم شدہ نعمت کسی کے ڈھونڈنے
نہیں مل سکتی۔

وَاَعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ
وَسَوْفَ يُؤْتِيْكَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۱۳۳ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ
بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۝ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۝۱۳۴

اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دیں، ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روشنی پر چلو۔ اللہ بڑا مقرر دان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے۔

۱۳۳ اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی وفاداریاں اللہ کے سوا کسی اور سے وابستہ نہ ہوں، اپنی ساری دلچسپیوں اور محنتوں اور عقیدتوں کو وہ اللہ کے آگے نذر کر دے، کسی چیز کے ساتھ بھی دل کا ایسا لگاؤ باقی نہ رہے کہ اللہ کی رضا کے لیے اُسے قربان نہ کیا جاسکتا ہو۔

۱۳۴ شکر کے اصل معنی اعترافِ نعمت یا احسانِ مندی کے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے ساتھ احسان فراموشی اور نیک حرامی کا رویہ اختیار نہ کرو بلکہ صحیح طور پر اس کے احسانِ مندی کو دیکھ کر کہ اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ تمہیں سزا دے۔

ایک محسن کے مقابلہ میں صحیح احسانِ مندانہ رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی دل سے اس کے احسان کا اعتراف کرے، زبان سے اس کا اقرار کرے اور عمل سے احسانِ مندی کا ثبوت دے۔ انہی تین چیزوں کے مجموعہ کا نام شکر ہے۔ اور اس شکر کا اقتضاء یہ ہے کہ اولاً آدمی احسان کو اُسی کی طرف منسوب کرے جس نے دراصل احسان کیا ہے، کسی دوسرے کو احسان کے شکریہ اور نعمت کے اعتراف میں اس کا سہقہ دار بنائے۔ ثانیاً آدمی کا دل اپنے محسن کے لیے محبت اور وفاداری کے جذبہ سے بہریز ہو اور اُس کے مخالفوں سے محبت و اخلاص اور وفاداری کا ذرہ برابر تعلق بھی نہ رکھے۔ ثالثاً وہ اپنے محسن کا مطیع و فرمانبردار ہو اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کے منشاء کے خلاف استعمال نہ کرے۔

۱۳۵ اصل میں لفظ "شاکر" استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ ہم نے "قدر دان" کیا ہے۔ شکر جب اللہ کی طرف سے بندے کی جانب ہو تو اس کے معنی "اعترافِ خدمت" یا "قدر دانی" کے ہوں گے اور جب بندے کی طرف سے اللہ کی جانب ہو تو اس کے معنی "اعترافِ نعمت" یا "احسانِ مندی کے معنی میں لیا جائے گا۔ اللہ کی طرف سے بندوں کا شکریہ ادا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا قدر شناس نہیں ہے، جتنی اور جیسی خدمات بھی بندے اس کی راہ میں بجالائیں، اللہ کے ہاں ان کی قدر کی جاتی ہے

﴿۱۳۸﴾

لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالشُّوْرِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظَلَمَ

وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا عَلِيمًا ﴿۱۳۹﴾ إِنَّ تَبْدُؤًا خَيْرًا أَوْ تُخَفُّوهُ أَوْ
تَعْفُوا عَنْ سُوءٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا ﴿۱۴۰﴾ إِنَّ الَّذِينَ
يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ

اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے، الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو، اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ (مظلوم ہونے کی صورت میں اگرچہ تم کو بدگوئی کا حق ہے لیکن اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کیے جاؤ، یا کم از کم بُرائی سے درگزر کرو تو اللہ کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے حالانکہ سزا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے

کسی کی خدمات و صلوات سے محروم نہیں رہیں، بلکہ وہ نہایت فیاضی کے ساتھ ہر شخص کو اس کی خدمت سے زیادہ صلہ دیتا ہے۔ بندوں کا حال تو یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے کیا اس کی قدر کم کرتے ہیں اور جو کچھ نہ کیا اس پر گرفت کرنے میں بڑی سختی دکھاتے ہیں۔ لیکن اللہ کا حال یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے نہیں کیا ہے اس پر عاصی کرنے میں وہ بہت نرمی اور چہم پوشی سے کام لیتا ہے اور جو کچھ کیا ہے اس کی قدر اس کے مرتبے سے بڑھ کر کرتا ہے۔

۱۳۸ اس ہیئت میں مسلمانوں کو ایک نہایت بلند درجہ کی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ منافق اور یہودی اور بت پرست سب کے سب اس وقت ہر ممکن طریقہ سے اسلام کی راہ میں روڑے اٹھانے اور اس کی پیروی قبول کرنے والوں کو سستانے اور پریشان کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ کوئی بدتر سے بدتر تدبیر ایسی نہ تھی جو وہ اس نئی تحریک کے خلاف استعمال نہ کر رہے ہوں۔ اس پر مسلمانوں کے اندر نفرت اور غصہ کے جذبات کا پیدا ہونا ایک قطری امر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اس قسم کے جذبات کا طوفان اٹھتے دیکھ کر فرمایا کہ بدگوئی پر زبان کھولنا تمہارے خدا کے نزدیک کوئی پسندیدہ کام نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تم مظلوم ہو اور اگر مظلوم ظالم کے خلاف بدگوئی پر زبان کھولے تو اُسے حق پہنچتا ہے۔ لیکن پھر بھی افضل یہی ہے کہ خفیہ ہو یا علانیہ ہر حال میں بھلائی کیے جاؤ اور بُرائیوں سے درگزر کرو، کیونکہ تم کو اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونا چاہیے۔ جس خدا کا قرب تم چاہتے ہو اس کی شان یہ ہے کہ نہایت عظیم اور بڑا بار ہے اس کی سماعت مجرموں تک کو رزق دیتا ہے اور بڑے سے بڑے قصور و پرہیز درگزر کیے چلا جاتا ہے۔ لہذا اس سے قریب تر

وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنُكْفِرُ بِبَعْضٍ ۚ وَيُرِيدُونَ
 أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا ۝ اُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ
 حَقًّا ۚ وَاعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ۝ وَالَّذِينَ
 آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اٰحَدٍ مِنْهُمْ اُولٰٓئِكَ
 سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ اُجْرُهُمْ وَاَوْفَوْا لَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

درمیان تفریق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے، اور کفر و ایمان کیے بیچ میں
 ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ سب پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے وہ سزا
 مہیا کر رکھی ہے جو انہیں ذلیل و خوار کر دینے والی ہوگی۔ بخلاف اس کے جو لوگ اللہ اور اس کے
 تمام رسولوں کو مانیں اور ان کے درمیان تفریق نہ کریں، ان کو ہم ضرور ان کے اجر عطا کریں گے، اور
 اللہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے ۛ

ہونے کے لیے تم بھی عالی حوصلہ اور وسیع القریب بنو۔

۱۷۸ یعنی کافر ہونے میں وہ لوگ جو نہ خدا کو مانتے ہیں نہ اس کے رسولوں کو، اور وہ جو خدا کو مانتے ہیں مگر
 رسولوں کو نہیں مانتے، اور وہ جو کسی رسول کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے، سب یکساں ہیں۔ ان میں سے کسی کے کافر
 ہونے میں ذرہ برابر شک کی گنجائش نہیں۔

۱۷۹ یعنی جو لوگ خدا کو اپنا واحد معبود اور مالک تسلیم کریں، اور اس کے بھیجے ہوئے تمام رسولوں کی پیروی
 قبول کریں، صرف وہی اپنے اعمال پر اجر کے مستحق ہیں، اور وہ جس درجہ کا عمل صالح کریں گے اسی درجہ کا اجر پائیں گے۔
 رہے وہ لوگ جنہوں نے خدا کی لاشریک الہیت و ربوبیت ہی تسلیم نہ کی، یا جنہوں نے خدا کے نمائندوں میں سے بعض کو
 قبول اور بعض کو رد کرنے کا باغیانہ طرز عمل اختیار کیا، تو ان کے لیے کسی عمل پر کسی اجر کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں
 ہوتا، کیونکہ ایسے لوگوں کا کوئی عمل خدا کی نگاہ میں قانونی عمل نہیں ہے۔

۱۸۰ یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائیں گے ان کا حساب لینے میں اللہ سخت گیری نہیں
 کرتے گا بلکہ ان کے ساتھ بہت نرمی اور درگزر سے کام لے گا۔

يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَىٰ أَكْبَرًا مِنْ ذَلِكَ فَقَالُوا أَرِنَا اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْهُمُ الصَّعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذَلِكَ ۖ وَآتَيْنَا مُوسَىٰ

یہ اہل کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کراؤ تو اس سے بڑھ چڑھ کر مجربانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰ سے کر چکے ہیں۔ اُس سے تو انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو اور اسی سرکشی کی وجہ سے یکایک ان پر بجلی ٹوٹ پڑتی تھی۔ پھر انہوں نے پھڑپھڑے کو اپنا معبود بنالیا، حالانکہ یہ کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔ اس پر بھی ہم نے ان سے درگزر کیا۔ ہم نے موسیٰ کو

۱۸۱ء مدینہ کے یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عجیب عجیب مطالبے کرتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ہم آپ کی رسالت اس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک کھلی کھائی کتاب آسمان سے نازل نہ ہو یا ہم میں سے ایک ایک شخص کے نام اوپر سے اس مضمون کی تحریر نہ آجائے کہ یہ محمد ہمارے رسول ہیں ان پر ایمان لاؤ۔

۱۸۲ء یہاں کسی واقعہ کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہودیوں کے جرائم کی ایک مختصر فہرست پیش کرنی مقصود ہے اُس لیے ان کی قومی تاریخ کے چند نمایاں واقعات کی طرف سرسری اشارات کیے گئے ہیں۔ اس آیت میں جس واقعہ کا ذکر ہے وہ سورہ بقرہ آیت ۴۹ میں بھی گزر چکا ہے۔ (ملاحظہ ہو سورہ بقرہ، حاشیہ نمبر ۷)

۱۸۳ء کھلی کھلی نشانیاں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رسول مقرر ہونے کے بعد سے لے کر فرعون کے غرق ہونے اور بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے تک پے درپے ان لوگوں کے مشاہدے میں آچکی تھیں۔ ظاہر ہے کہ سلطنت مصر کی عظیم شان طاقت کے بچوں سے جس نے بنی اسرائیل کو چھڑایا تھا وہ کوئی گائے کا بچہ نہ تھا بلکہ اللہ رب العالمین تھا۔ مگر یہ اس قوم کی باطل پرستی کا کمال تھا کہ خدا کی قدرت اور اس کے فضل کی روشن ترین نشانیاں کا تجربہ اور مشاہدہ کر چکنے کے بعد بھی جب مجھکی تو اپنے معن خدا کے آگے نہیں بلکہ ایک پھڑپھڑے کی مصنوعی صورت ہی کے آگے مجھکی۔

سُلْطَنَا مُبِينًا ۝ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّورَ بِمِيثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمْ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ
وَآخَذْنَا مِنْهُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا ۝ فِيمَا نَقُضُهُمْ مِّيثَاقَهُمْ وَ
كُفِّرَهُمْ بِالْأَيْتِ اللَّهِ وَقَتْلِهِمُ الْأَنْبِيَاءَ بَغَيْرِ حَقٍّ وَقَوْلِهِمْ
قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ

صریح فرمان عطا کیا اور ان لوگوں پر طور کو اٹھا کر ان سے (اُس فرمان کی اطاعت کا) عہد لیا۔
ہم نے ان کو حکم دیا کہ دروازہ میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہوں ہم نے ان سے کہا کہ
سبوت کا قانون نہ توڑو اور اس پر ان سے سخت عہد لیا۔ آخر کار ان کی عہد شکنی کی وجہ سے، اور
اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا اور یہاں تک
کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں۔ حالانکہ درحقیقت ان کی باطل پرستی کے
سبب سے اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ بہت کم ایمان

۱۸۴ صریح فرمان سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تختوں پر لکھ کر دیے گئے تھے۔ سورہ
اعراف ۱۷۰ میں اس کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ آئے گا۔ اور عہد سے مراد وہ میثاق ہے جو کہ طور کے دامن میں
بنی اسرائیل کے نمائندوں سے لیا گیا تھا۔ سورہ بقرہ آیت ۶۳ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے اور اعراف آیت ۱۷۱ میں پھر اس کی
طرف اشارہ آئے گا۔

۱۸۵ بقرہ آیت ۵۸-۵۹ وحاشیہ نمبر ۷۵۔

۱۸۶ بقرہ آیت ۶۵۔ وحاشیہ نمبر ۸۶ و ۸۳۔

۱۸۷ یسودوں کے اس قول کی طرف سورہ بقرہ آیت ۸۸ میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ لوگ تمام
باطل پرست جملہ کی طرح اس بات پر فخر کرتے تھے کہ جو خیالات اور عقبات اور رسم و رواج ہم نے اپنے باپ دادا سے
پائے ہیں ان پر ہمارا عقیدہ اتنا پختہ ہے کہ کسی طرح ہم ان سے نہیں ہٹائے جاسکتے۔ جب کبھی خدا کی طرف سے پیغمبروں نے
ہم ان کو سمجھانے کی کوشش کی، انہوں نے ان کو یہی جواب دیا کہ تم خواہ کوئی دلیل اور کوئی آیت لے آؤ ہم تمہاری کسی

الْأَقْلِيَّةُ ۝ وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلَى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا ۝

لاتے ہیں — پھر اپنے کفر میں اتنے بڑھے کہ مریم پر سمنت بہتان لگایا،

بات کا اثر نہ لیں گے، جو کچھ مانتے اور کرتے چلے آئے ہیں وہی مانتے رہیں گے اور وہی کیے چلے جائیں گے۔ (ماہنامہ سورۃ بقرہ، حاشیہ نمبر ۹۴)۔

۱۸۸۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔

۱۸۹۔ یہ فقرہ اصل سلسلہ تقریر سے تعلق رکھتا ہے۔

۱۹۰۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا معاملہ یہودی قوم میں فی الواقع ذرہ برابر بھی مشتبہ نہ تھا بلکہ جس روز وہ پیدا ہوئے تھے اسی روز اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو اس بات پر گواہ بنا دیا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی شخصیت کا بچہ ہے جس کی ولادت معجزے کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی اخلاقی جرم کا۔ جب بنی اسرائیل کے ایک شریف ترین اور مشہور و نامور مذہبی گھرانے کی بن بیابہ لڑکی گود میں بچہ لیے ہوئے آئی تو قوم کے بڑے اور چھوٹے سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اس کے گھر پر جرم کر کے آگے تو اس لڑکی نے ان کے سوالات کا جواب دینے کے بجائے خاموشی کے ساتھ اس نوزائیدہ بچے کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ تمہیں جواب دے گا۔ مجمع نے حیرت سے کہا کہ اس بچے سے ہم کیا پوچھیں جو گوارے میں لینا ہوتا ہے۔ مگر کیا ایک وہ بچہ گویا ہو گیا اور اس نے نہایت صفات اور فصیح زبان میں مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ اِنِّی عَبْدُ اللّٰهِ وَابْنُ مَرْیَمَ ۝ اَلْحَسْبُ وَبِئْسَ نَبِیُّنَ ۝ میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔ (سورۃ مریم رکوع ۲)۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اُس شبہ کی ہمیشہ کے لیے بڑکھٹ دی تھی جو ولادتِ مسیح کے بارے میں پیدا ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سنِ شباب کو پہنچنے تک کبھی کسی نے نہ حضرت مریمؑ پر زنا کا الزام لگایا، نہ حضرت عیسیٰ کو ناجائز ولادت کا طعنہ دیا۔ لیکن جب تیس برس کی عمر کو پہنچ کر آپ نے نبوت کے کام کی ابتدا فرمائی، اور جب آپ نے یہودیوں کو ان کی بد اعمالیوں پر ملامت کرنی شروع کی، ان کے علماء و فقہاء کو ان کی ریا کاریوں پر ٹوکا، ان کے عوام اور خواص سب کو اُس اخلاقی زوال پر متنبہ کیا جس میں وہ مبتلا ہو گئے تھے، اور اُس پر خطر راستے کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی جس میں خدا کے دین کو عملاً قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں اور ہر عاصی پر شیطانِ قوتوں سے لڑائی کا سامنا تھا تو یہ بے باک مجرم صداقت کی آواز کو دبانے کے لیے ہر ناپاک سے ناپاک ہتھیار استعمال کرنے پر تیار آئے۔ اس وقت انہوں نے وہ بات کہی جو تیس سال تک نہ کہی تھی کہ مریم علیہا السلام معاذ اللہ زانیہ ہیں اور عیسیٰ ابن مریم ولد الزنا۔ حالانکہ یہ قلم با یقین جانتے تھے کہ یہ دونوں ماں بیٹے اس گندگی سے بالکل پاک ہیں۔ پس درحقیقت ان کا یہ بہتان کسی حقیقی شبہ کا نتیجہ نہ تھا جو واقعی ان کے دلوں میں موجود ہوتا، بلکہ خالص بہتان تھا جو انہوں نے جان بوجھ کر محض حق کی مخالفت کے لیے گھڑا تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اسے قلم اور بھٹ کے بجائے کفر قرار دیا ہے کیونکہ اس الزام سے ان کا اصل مقصد خدا کے دین کا

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ
وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ

اور خود کہا کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے۔ حالانکہ فی الواقع انہوں نے اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا۔ اور جن لوگوں نے

راستہ روکنا تھا نہ کہ ایک بے گناہ عورت پر الزام لگانا۔

۹۱۔ یعنی جراثیم جراثیم اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ رسول کو رسول جانتے تھے اور پھر اس کے قتل کا اقدام کیا اور فخر کیا کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے۔ اُوپر ہم نے گوارے کے واقعہ کا جو حوالہ دیا ہے اس پر غور کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہودیوں کے لیے مسیح علیہ السلام کی نبوت میں شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی پھر جو روشن نشانیاں انہوں نے حضرت موصوف سے مشاہدہ کیں (جن کا ذکر سورہ آل عمران نہ کوٹ میں گزر چکا ہے) ان کے بعد تو یہ معاملہ بالکل ہی غیر مشتبہ ہو چکا تھا کہ آنجناب اللہ کے پیغمبر ہیں۔ اس لیے واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر نہ تھا بلکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ہم اس جرم کا الزام اس شخص کے ساتھ کر رہے ہیں جو اللہ کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہے۔

بظاہر یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کوئی قوم کسی شخص کو نبی جانتے اور مانتے ہوئے اسے قتل کر دے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ بگڑی ہوئی قوموں کے انداز و اطوار ہوتے ہی کچھ عجیب ہیں۔ وہ اپنے درمیان کسی ایسے شخص کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں جو ان کی بُرائیوں پر انہیں ٹوٹے اور نا جائز کاموں سے ان کو روکے۔ ایسے لوگ چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہوں ہمیشہ بدکردار قوموں میں قید اور قتل کی سزائیں پاتے ہی رہے ہیں۔ تلمود میں لکھا ہے کہ بہت نصرت نے جب بیت المقدس مستح کیا تو وہ میل سلیمانی میں داخل ہوا اور اس کی سیر کرنے لگا۔ عین قربان گاہ کے سامنے ایک جگہ دیوار پر اسے ایک تیر کا نشان نظر آیا۔ اس نے یہودیوں سے پوچھا یہ کیسا نشان ہے؟ انہوں نے جواب دیا یہاں ذکر کیا وہ نبی کو ہم نے قتل کیا تھا۔ وہ ہماری بُرائیوں پر ہمیں طاعت کرتا تھا۔ آخر جب ہم اس کی ملامتوں سے تنگ آ گئے تو ہم نے اسے مار ڈالا۔ بائبل میں یرمیاہ نبی کے متعلق لکھا ہے کہ جب بنی اسرائیل کی بد اخلاقیات حد سے گزر گئیں اور حضرت یرمیاہ نے ان کو سبکیا کر ان اعمال کی پاداش میں غلام کو دوسری قوموں سے پامال کر دے گا تو ان پر الزام لگایا گیا کہ یہ شخص کس دیوں (کھانوں) سے کھا رہا ہے اور قوم کا خدا ہے۔ اس الزام میں ان کو جیل بھیج دیا گیا۔ خود حضرت مسیح کے واقعہ صلیب سے دو ڈھائی سال پہلے ہی حضرت یحییٰ کا معاملہ پیش آچکا تھا۔ یہودی بالعموم ان کو نبی جانتے تھے اور کم از کم یہ تو مانتے ہی تھے کہ وہ ان کی قوم کے صالح ترین لوگوں میں سے ہیں۔ مگر جب انہوں نے حیر و دیس (والی ریاست یہودیہ) کے دیہات کی بُرائیوں پر تنقید کی تو

اٰخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيَ شَكٌّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا
اِتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝۱۸۱ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ

اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں، ان کے پاس اس معاملہ میں کوئی علم نہیں ہے، محض گمان ہی کی پیروی ہے۔ انہوں نے مسیح کو یقین کے ساتھ قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اسے برداشت نہ کیا گیا۔ پہلے جیل بھیجے گئے، اور پھر والی ریاست کی معشوقہ کے مطالبے پر ان کا سر قلم کر دیا گیا۔ یہودیوں کے اس ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے زعم میں مسیح کو سولی پر چڑھانے کے بعد سینے پر ہاتھ مار کر کہا جو ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے۔

۱۹۲ء یہ پھر جملہ معترضہ ہے۔

۱۹۳ء یہ آیت تصریح کرتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھانے جانے سے پہلے اٹھالیے گئے تھے اور یہ کہ عیسویوں اور یہودیوں، دونوں کا یہ خیال کہ مسیح نے صلیب پر جان دی، محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ قرآن اور بائبل کے بیانات کا مقابلہ مطالعہ کرنے سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ غالباً پیلطس کی عدالت میں تو پیشی آپ ہی کی ہوئی تھی، مگر جب وہ سزا موت کا فیصلہ سنا چکا اور جب یہودیوں نے مسیح جیسے پاک نفس انسان کے مقابلہ میں ایک ڈاکو کی جان کو زیادہ قیمتی ٹھیرا کر اپنی حق دشمنی و باطل پسندی پر آخری ٹھہر بھی لگا دی، تب اللہ تعالیٰ نے کسی وقت آنجناب کو اٹھایا۔ بعد میں یہودیوں نے جس شخص کو صلیب پر چڑھایا وہ آپ کی ذات مقدس نہ تھی بلکہ کوئی اور شخص تھا جس کو نہ معلوم کس وجہ سے ان لوگوں نے عیسیٰ ابن مریم سمجھ لیا۔ تاہم ان کا جرم اس سے کم نہیں ہوتا کیونکہ جس کو انہوں نے کانٹوں کا تاج پہنایا، جس کے منہ پر تھوکا اور جسے ذلت کے ساتھ صلیب پر چڑھایا اس کو وہ عیسیٰ بن مریم ہی سمجھ رہے تھے۔ اب یہ معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں کہ معاملہ کس طرح ان کے لیے مشتبہ ہو گیا۔ چونکہ اس باب میں کوئی یقینی ذریعہ معلومات نہیں ہے اس لیے مجرد قیاس و گمان اور افواہوں کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُس شبہ کی ذمیت کیا تھی جس کی بنا پر یہودی یہ سمجھے کہ انہوں نے عیسیٰ ابن مریم کو صلیب دی ہے دراصل حالے کہ عیسیٰ ابن مریم ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔

۱۹۴ء اختلاف کرنے والوں سے مراد عیسائی ہیں۔ اُن میں مسیح علیہ السلام کے صلیب پر نہ پڑنے پر کوئی ایک متفق علیہ قول نہیں ہے بلکہ بیسیوں اقوال ہیں جن کی کثرت خود اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اصل حقیقت ان کے لیے بھی مشتبہ ہی رہی۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر جو شخص چڑھایا گیا وہ مسیح نہ تھا بلکہ مسیح کی شکل میں کوئی اور تھا جسے یہودی اور رومی سپاہی ذلت کے ساتھ صلیب دے رہے تھے اور مسیح وہیں کسی جگہ کھڑا ان کی حماقت پر ہنس رہا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر چڑھایا تو مسیح ہی کو گیا تھا مگر اُن کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی بلکہ اُسے جانے کے بعد ان میں جان تھی۔ کوئی کہتا ہے کہ انہوں نے

إِلَيْهِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا

اٹھالیا، اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔ اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا صلیب پر وفات پائی اور پھر وہ جی اٹھے اور کم و بیش دس مرتبہ اپنے قلعے حواریوں سے ملے اور باتیں کیں۔ کوئی کتاب ہے کہ صلیب کی موت مسیح کے جسم انسانی پر واقع ہوئی اور وہ دفن ہوا مگر انجیلیت کی رُوح جو اس میں تھی وہ اٹھالی گئی۔ اور کوئی کتاب ہے کہ مرنے کے بعد مسیح علیہ السلام جسم میت زندہ ہونے اور جسم میت اٹھانے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان لوگوں کے پاس حقیقت کا علم ہوتا تو اتنی قلعے باتیں ان میں مشہور نہ ہوتیں۔

۱۹۵ء یہ اس معاملہ کی اصل حقیقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے۔ اس میں جزم اور صراحت کے ساتھ جو چیز بتائی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ حضرت مسیح کو قتل کرنے میں یہودی کا یہاب نہیں ہوئے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھایا۔ اب رہا یہ سوال کہ اٹھانے کی کیفیت کیا تھی، تو اس کے متعلق کوئی تفصیل قرآن میں نہیں بتائی گئی۔ قرآن نہ اس کی تصریح کرتا ہے کہ اللہ ان کو جسم و رُوح کے ساتھ کرۂ زمین سے اٹھا کر آسمانوں پر کہیں لے گیا، اور نہ ہی صاف کہتا ہے کہ انہوں نے زمین پر طبعی موت پائی اور صرف ان کی رُوح اٹھائی گئی۔ اس لیے قرآن کی بنیاد پر نہ تو ان میں سے کسی ایک پہلو کی قطعی نفی کی جاسکتی ہے اور نہ اثبات۔ لیکن قرآن کے انداز بیان پر غور کرنے سے یہ بات بالکل نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے کہ اٹھانے جانے کی نوعیت و کیفیت خواہ کچھ بھی ہو، ہر حال مسیح علیہ السلام کے ساتھ اللہ نے کوئی ایسا معاملہ ضرور کیا ہے جو غیر معمولی نوعیت کا ہے۔ اس غیر معمولی پن کا اظہار تین چیزوں سے ہوتا ہے:

ایک یہ کہ عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کے جسم و رُوح میت اٹھانے جانے کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور ان اسباب میں سے تھا جن کی بنا پر ایک بہت بڑا گروہ انجیلیت مسیح کا قائل ہوا ہے، لیکن اس کے باوجود قرآن نے نہ صرف یہ کہ اس کی صاف صاف تردید نہیں کی بلکہ بعینہ وہی ”رفع“ (Ascension) کا لفظ استعمال کیا جو عیسائی اس واقعہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کتاب مبین کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ کسی خیال کی تردید کرنا چاہتی ہو اور پھر ایسی زبان استعمال کرے جو اس خیال کو مزید تقویت پہنچانے والی ہو۔

دوسرے یہ کہ اگر مسیح علیہ السلام کا اٹھایا جانا ویسا ہی اٹھایا جاتا ہوتا جیسا کہ ہر مرنے والا دنیا سے اٹھایا جاتا ہے، یا اگر اس رفع سے مراد محض درجات و مراتب کی بلندی ہوتی جیسے حضرت ادریس کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ رَفَعْنَاهُ مَكَانًا ثَلَاثِينَ، تو اس مضمون کو بیان کرنے کا انداز نہ ہوتا جو ہم یہاں دیکھ رہے ہیں۔ اس کو بیان کرنے کے لیے زیادہ مناسب الفاظ یہ ہو سکتے تھے کہ ”یقیناً انہوں نے مسیح کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو زندہ بچایا اور پھر طبعی موت دی یہودیوں نے اس کو ذلیل کرنا چاہا تھا مگر اللہ نے اس کو بلند درجہ عطا کیا“۔

تیسرے یہ کہ اگر یہ رفع ویسا ہی معمولی قسم کا رفع ہوتا جیسے ہم محاورہ میں کسی مرنے والے کو کہتے ہیں کہ اُسے

لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ۝

جو اُس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے گا اور قیامت کے روز وہ ان پر گواہی دے گا، اللہ نے اٹھایا تو اس کا ذکر کرنے کے بعد یہ فقرہ باطل غیر موزوں تھا کہ "اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔" یہ تو صرف کسی ایسے واقعہ کے بعد ہی موزوں و مناسب ہو سکتا ہے جس میں اللہ کی قوت قاہرہ اور اس کی حکمت کا غیر معمولی ظہور ہوا ہو۔

اس کے جواب میں قرآن سے اگر کوئی دلیل پیش کی جاسکتی ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ صرف یہ ہے کہ سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے مَوْتِکَ کا لفظ استعمال کیا ہے (آیت ۱۰)۔ لیکن جیسا کہ وہاں ہم حاشیہ نمبر ۱۱ میں واضح کر چکے ہیں، یہ لفظ طبعی موت کے معنی میں صریح نہیں ہے بلکہ قبضِ رُوح اور قبضِ رُوح و جسم دونوں پر دلالت کر سکتا ہے۔ لہذا یہ اُن قرآن کو ساقط کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ بعض لوگ جن کو مسیح کی طبعی موت کا حکم لگانے پر اصرار ہے سوال کرتے ہیں کہ کوئی کا لفظ قبضِ رُوح و جسم پر استعمال ہونے کی کوئی اور نظیر بھی ہے، لیکن جب کہ قبضِ رُوح و جسم کا واقعہ تمام نزع انسانی کی تاریخ میں پیش ہی ایک مرتبہ آیا ہو تو اس معنی پر اس لفظ کے استعمال کی نظیر پُرچھنا محض ایک بے معنی بات ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ آیا اہل لغت میں اس استعمال کی گنجائش ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو ماننا پڑے گا کہ قرآن نے رفع جسمانی کے عقیدہ کی صاف تردید کرنے کے بجائے یہ لفظ استعمال کر کے اُن قرآن میں ایک اور قرینہ کا اضافہ کر دیا ہے جن سے اس عقیدہ کو ٹھنی مدد ملتی ہے اور نہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ موت کے صریح لفظ کو چھوڑ کر وفات کے متعلّق لعینین لفظ کو ایسے موقع پر استعمال کرتا جہاں رفع جسمانی کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور ایک فاسد اعتقاد یعنی اگر حیاتِ مسیح کے اعتقاد کا موجب بن رہا تھا۔ پھر رفع جسمانی کے اس عقیدہ کو مزید تقویت اُن کثیر التعلّلاتِ احادیث سے پہنچتی ہے جو قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے دوبارہ دنیا میں آنے اور زوال سے جنگ کرنے کی تصریح کرتی ہیں (تفسیر سورۃ احزاب کے مضمیمہ میں ہم نے ان احادیث کو نقل کر دیا ہے)۔ اُن سے حضرت عیسیٰ کی آمد ثانی تو قطعی طور پر ثابت ہے۔ اب یہ شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ ان کا مرنے کے بعد وہاں اس دنیا میں آنا یا نہ تو بہت قیاس ہے یا زندہ کہیں خدایا کائنات میں موجود ہونا اور پھر واپس آنا ۹

۱۹۶ اس فقرے کے دو معنی بیان کیے گئے ہیں اور الفاظ میں دونوں کا یکساں احتمال ہے۔ ایک معنی وہ جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کیے ہیں۔ دوسرے یہ کہ "اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے مسیح پر ایمان نہ لے آئے۔" اہل کتاب سے مراد یہودی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ عیسائی بھی ہوں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہو گا کہ مسیح کی طبعی موت جب واقع ہوگی اس وقت جتنے اہل کتاب موجود ہوں گے وہ سب ان پر ایمانی ان کی رسالت پر ایمان لاپکے ہوں گے۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہو گا کہ تمام اہل کتاب پر مرنے سے عین قبل رسالتِ مسیح کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اور وہ مسیح پر ایمان لے آتے ہیں، مگر یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ ایمان لانا مفید نہیں ہو سکتا۔ دونوں معنی

فَبُظْلِمَ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ
لَهُمْ وَبَرَصَدَّاهُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا ۖ وَآخَذَهُمُ
الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۚ

غرض ان یہودی بن جانے والوں کے اسی ظالمانہ رویہ کی بنا پر اور اس بنا پر کہ یہ بکثرت اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، اور منہ دیتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا، اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں، ہم نے بہت سی وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں،

متعدد صحابہ تابعین اور اکابر مفسرین سے منقول ہیں اور صحیح مراد صرف اللہ ہی کے علم میں ہے۔

۱۹۷ء یعنی یودیوں اور عیسائیوں نے مسیح علیہ السلام کے ساتھ اور اُس پیغام کے ساتھ جو آپ لائے تھے، جو معاملہ کیا ہے اس پر آپ خداوند تعالیٰ کی عدالت میں گواہی دیں گے۔ اس گواہی کی کچھ تفصیل آجے سورہ مائدہ کے آخری رکوع میں آنے والی ہے۔

۱۹۸ء جملہ معترضہ ختم ہونے کے بعد یہاں سے یہودی سلسلہ تقریر شروع ہوتا ہے جو اوپر سے چلا آ رہا تھا۔
۱۹۹ء یعنی صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ خود اللہ کے راستے سے منحرف ہیں، بلکہ اس قدر بے باک مجرم بن چکے ہیں کہ دنیا میں خدا کے بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے جو تحریک بھی اٹھتی ہے، اکثر اس کے پیچھے یہودی دماغ اور یہودی سرمایہ کاری کام کرتا نظر آتا ہے، اور راہ حق کی طرف بلانے کے لیے جو تحریک بھی شروع ہوتی ہے اکثر اس کے مقابلہ میں یہودی ہی سب سے بڑھ کر مزاحمت بنتے ہیں، درآن حالے کہ یہ کم بہت کتاب اللہ کے حامل اور انبیاء کے وارث ہیں۔ ان کا تازہ ترین جرم یہ اشتراکی تحریک ہے جسے یہودی دماغ نے اختراع کیا اور یہودی رہنمائی ہی نے پروان چڑھایا ہے۔ ان نام نہاد اہل کتاب کے نصیب میں یہ جرم بھی مقدر تھا کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جو نظام زندگی اور نظام حکومت خدا کے صریح احکام پر، خدا کے حکم کھلا دشمنی پر، خدا پرستی کو مٹا دینے کے علی الاعلان عزم و ارادہ پر تعمیر کیا گیا اس کے موجد و مخترع اور بانی و سربراہ کا روسی علیہ السلام کے نام لیا جوں۔ اشتراکیت کے بعد زمانہ جدید میں گمراہی کا دوسرا بڑا ستون فریڈ کا فلسفہ ہے اور غلط یہ ہے کہ وہ بھی بنی اسرائیل ہی کا ایک فرد ہے۔

۲۰۰ء قوراء میں بالفاظ صریح یہ حکم موجود ہے کہ:

”اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو جو تیرے پاس رہتا ہو، قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے منہ دینا۔ اگر تو کسی وقت اپنے ہمسایہ کے کپڑے گرد رکھ بھی لے تو منورج کے ڈوبنے تک اس کو واپس کر دینا کیونکہ فقط وہی ایک اُس کا اوڑھنا ہے اس کے جسم کا وہی لباس ہے،

وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٦١﴾ لَكِنَّ الرَّاكِبِينَ
فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ
وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ وَالْمُؤْتُونَ

اور جو لوگ ان میں سے کافر ہیں ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ مگر ان میں جو لوگ
پختہ علم رکھنے والے ہیں اور ایماندار ہیں وہ سب اُس تعلیم پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف نازل
کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھی۔ اس طرح کے ایمان لانے والے اور نماز و زکوٰۃ کی

پھر وہ کیا اور کھ کھسکے گا۔ پس جب وہ فریاد کرے گا تو میں اُس کی سنوں گا کیونکہ میں مہربان ہوں۔ (اخراج

باب ۲۲: ۲۵-۲۶)

اس کے علاوہ اور بھی کئی مقامات پر تورات میں مژدہ کی حرمت وارد ہوئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسی تورات کے
ماننے والے یہودی آج دنیا کے سب سے بڑے مژدہ خوار ہیں اور اپنی تنگ دلی و سنگ دلی کے لیے ضرب المثل بن چکے ہیں۔

۲۰۱۔ غالباً یہ اُسی مضمون کی طرف اشارہ ہے جو آگے سورہ افعام آیت ۱۴۶ میں آنے والا ہے۔ یعنی یہ کہ بنی اسرائیل
پر تمام وہ جانور حرام کر دیے گئے جن کے ناخن ہوتے ہیں، اور ان پر گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کر دی گئی۔ اس کے
علاوہ ممکن ہے کہ اشارہ اُن دوسری پابندیوں اور سختیوں کی طرف بھی ہو جو یہودی فقہ میں پائی جاتی ہیں۔ کسی گروہ کے لیے
دائرہ زندگی کو تنگ کر دیا جانا فی الواقع اس کے حق میں ایک طرح کی سزا ہی ہے۔ (مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو سورہ افعام

حاشیہ نمبر ۱۲۲)

۲۰۲۔ یعنی اس قوم کے جو لوگ ایمان و اطاعت سے منحرف اور بغاوت و انکار کی روش پر قائم ہیں ان کے لیے
خدا کی طرف سے دردناک سزا تیار ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں جو عجز و تکبر سزا ان کو مل رہی ہے وہ کبھی
کسی دوسری قوم کو نہیں ملی۔ دو ہزار برس ہو چکے ہیں کہ زمین پر کہیں ان کو عزت کا ٹھکانا میسر نہیں۔ دنیا میں ہر بڑے بڑے گئے
ہیں اور ہر جگہ غریب الوطن ہیں۔ کوئی دودار یا نہیں گزرتا جس میں وہ دنیا کے کسی نہ کسی نقطہ میں ذلت کے ساتھ پامال نہ کیے جاتے
ہوں اور اپنی دولت مندی کے باوجود کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ پھر غضب یہ ہے کہ
قومیں پیدا ہوتی اور مٹتی ہیں مگر اس قوم کو موت بھی نہیں آتی۔ اس کو دنیا میں لایموت و فساد کی سزا دی گئی ہے تاکہ
قیامت تک دنیا کی قوموں کے لیے ایک زندہ نمونہ عبرت بنی رہے اور اپنی سرگزشت سے یہ سبق دیتی رہے کہ خدا کی کتاب
بطل میں رکھ کر خدا کے مقابل میں باغیانہ جساتیں کرنے کا یہ انجام ہوتا ہے۔ یہی آخرت قرآن شاء اللہ وہاں کا عذاب اس سے
بھی زیادہ دردناک ہو گا۔ (اس موقع پر جو شبہ فلسطین کی اسرائیلی ریاست کے قیام کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اسے رفع کرنے

الزَّكَاةَ وَالْمُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أُولَٰئِكَ
سَنُؤْتِيهِمْ أَجْرًا عَظِيمًا ۝۱۲۶ إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا
إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ
وِإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ
يُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا ۝۱۲۷

پابندی کرنے والے اور اللہ اور روزِ آخر پر سچا عقیدہ رکھنے والے لوگوں کو ہم ضرور اجرِ عظیم عطا کریں گے ۝

اسے محمد! ہم نے تمہاری طرف اُسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور اس کے بعد پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی۔ ہم نے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف وحی بھیجی۔ ہم نے داؤد کو زبور دی۔

کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ آل عمران آیت (۱۱۲)۔

۲۰۳ یعنی ان میں سے جو لوگ کتبِ آسمانی کی حقیقی تعلیم سے واقف ہیں اور ہر قسم کے تعصب، جاہلانہ ضد، آہانی تقلید اور نفس کی بندگی سے آزاد ہو کر اُس امرِ حق کو سچے دل سے مانتے ہیں جس کا ثبوت آسمانی کتابوں سے ملتا ہے ان کی روش کا فردِ عالم یہودیوں کی عام روش سے بالکل مختلف ہے۔ ان کو بیک نظر محسوس ہو جاتا ہے کہ جس دین کی تعلیم پچھلے انبیاء نے دی تھی اسی کی تعلیم قرآن دے رہا ہے اس لیے وہ بے لاگ حق پرستی کے ساتھ دونوں پر ایمان لے آتے ہیں۔

۲۰۴ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی انوکھی چیز لے کر نہیں آئے ہیں جو پہلے نہ آئی ہو۔ ان کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں دنیا میں پہلی مرتبہ ایک نئی چیز پیش کر رہا ہوں۔ بلکہ دراصل اُن کو بھی اسی ایک منبعِ علم سے ہدایت ملی ہے جس سے تمام پچھلے انبیاء کو ہدایت ملتی رہی ہے، اور وہ بھی اُسی ایک صداقت و حقیقت کو پیش کر رہے ہیں جسے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیدا ہونے والے پیغمبرِ عید سے پیش کرتے چلے آئے ہیں۔

وحی کے معنی ہیں اشارہ کرنا، دل میں کوئی بات ڈالنا، خفیہ طریقے سے کوئی بات کہنا، پیغام بھیجنا۔

۲۰۵ موجودہ بائبل میں زبور کے نام سے جو کتاب پائی جاتی ہے وہ ساری کی ساری زبورِ داؤد نہیں ہے۔ اس میں بکثرت مزایرِ دوسرے لوگوں کے بھی بھر دیے گئے ہیں اور وہ اپنے اپنے معنیوں کی طرف منسوب ہیں۔ البتہ جن مزایر پر

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَمْ نَقْصُصْهُمْ
عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ۝ رُسُلًا مُبَشِّرِينَ
وَمُنذِرِينَ لئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ ۚ بَعْدَ

ہم نے اُن رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور
اُن رسولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا۔ ہم نے موسیٰ سے اس طرح گفتگو کی جس طرح
گفتگو کی جاتی تھے۔ یہ سارے رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر
بھیجے گئے تھے تاکہ اُن کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی

تصریح ہے کہ وہ حضرت داؤد کے ہیں ان کے اندر فی الواقع کلام حق کی روشنی محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح بائبل میں اشالیہ ایمان
کے نام سے جو کتاب موجود ہے اس میں بھی اچھی خاصی آئینہ پائی جاتی ہے اور اس کے آخری دو باب تو صریحاً اٹھاتی ہیں اور
اس کے باوجود ان اشالیہ کا بڑا حصہ صحیح و برحق معلوم ہوتا ہے۔ ان دو کتابوں کے ساتھ ایک اور کتاب حضرت ابراہیم کے نام سے
بھی بائبل میں درج ہے، لیکن حکمت کے بہت سے جواہر اپنے اندر رکھنے کے باوجود اسے پڑھتے ہوئے یہ یقین نہیں آتا کہ
واقعی حضرت ابراہیم کی طرف اس کتاب کی نسبت صحیح ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں اور خود اس کتاب کی ابتدا میں حضرت ابراہیم
کے جس معجز حکیم کی تعریف کی گئی ہے اس کے بالکل برعکس وہ ساری کتاب میں یہ بتاتی ہے کہ حضرت ابراہیم اپنی مصیبت کے زمانہ
میں اللہ تعالیٰ کے خلاف مراءشات گزرتے ہوئے تھے، حتیٰ کہ ان کے ہمنشین انہیں اس امر پر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے
کہ خدا عالم نہیں ہے، مگر وہ کسی طرح ان کو نہ دیتے تھے۔

ان صحیفوں کے علاوہ بائبل میں انبیاء بنی اسرائیل کے ۷۰ مصحف اور بھی درج ہیں جن کا بیشتر حصہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔
مخصوصاً یسعیاہ، یرمیاہ، حزقی ایل، عاموس اور بعض دوسرے صحیفوں میں تو کثرت مقامات ایسے آتے ہیں جنہیں پڑھ کر آدمی کی
روح وجد کرنے لگتی ہے۔ ان میں الہامی کلام کی شان مزج طور پر محسوس ہوتی ہے۔ ان کی اخلاقی تعلیم ان کا شرک کے خلاف
بجاء ان کا توحید کے حق میں پر زور استدلال اور ان کی بنی اسرائیل کے اخلاقی زوال پر سخت تنقیدیں پڑھتے وقت آدمی یہ
محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان بائبل میں حضرت مسیح کی تقریریں اور قرآن مجید اور یہ صحیفے ایک ہی سرچشمے سے نکلی ہوئی سوتیں ہیں۔
۲۷۶ دوسرے انبیاء علیہم السلام پر تو وحی اس طرح آتی تھی کہ ایک آواز آرہی ہے یا فرشتہ پیغام منارہا ہے اور وہ
سن رہے ہیں لیکن موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہ خاص معاملہ برتا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان سے گفتگو کی۔ بندے اور خدا کے درمیان
اس طرح باتیں ہوتی تھیں جیسے دو شخص آپس میں بات کرتے ہیں۔ مثال کے لیے اس گفتگو کا حوالہ کافی ہے جو سورۃ طہ میں نقل کی گئی

الرُّسُلُ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝۱۶۵ لَكِنَّ اللَّهَ يَشْهَدُ بِمَا
 أَنْزَلَ إِلَيْكَ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ وَالْمَلَكُ يَشْهَدُونَ ۝ وَكَفَى
 بِاللَّهِ شَهِيدًا ۝۱۶۶ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ
 اللَّهِ قَدْ ضَلُّوا ضَلَالًا بَعِيدًا ۝۱۶۷ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ
 يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرْ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ۝۱۶۸ إِلَّا طَرِيقَ
 جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۝ وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ۝۱۶۹

حجت نہ رہتے اور اللہ بہر حال غالب رہنے والا اور حکیم و داناستے۔ (لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں)
 مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ اُس نے تم پر نازل کیا ہے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور اس پر
 ملائکہ بھی گواہ ہیں اگرچہ اللہ کا گواہ ہونا بالکل کفایت کرتا ہے۔ جو لوگ اس کو ماننے سے خود انکار
 کرتے ہیں اور دوسروں کو خدا کے راستہ سے روکتے ہیں وہ یقیناً گمراہی میں حق سے بہت دور
 بھٹک گئے ہیں۔ اس طرح جن لوگوں نے کفر و بغاوت کا طریقہ اختیار کیا اور ظلم و ستم پر اتر آئے
 اللہ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا اور انہیں کوئی راستہ بجز جہنم کے راستہ کے نہ دکھائے گا جس میں
 وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

ہے۔ بائبل میں بھی حضرت موسیٰ کی اس خصوصیت کا ذکر اسی طرح کیا گیا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ ”جیسے کوئی شخص اپنے دوست
 بات کرتا ہے ویسے ہی خداوند دُور و ہر کوئی موسیٰ سے باتیں کرتا تھا۔“ (خروج ۳۳: ۱۱)

۲۰۷ یعنی ان سب کا ایک ہی کام تھا اور وہ یہ کہ جو لوگ خدا کی بھیجی ہوئی تعلیم پر ایمان لائیں اور اپنے رویہ کو
 اس کے مطابق درست کر لیں انہیں فلاح و سعادت کی خوشخبری سنادیں اور جو فکر و عمل کی غلط راہوں پر چلتے رہیں ان کو اس
 غلط روی کے بُرے انجام سے آگاہ کر دیں۔

۲۰۸ یعنی ان تمام پیغمبروں کے بھیجنے کی ایک ہی غرض تھی اور وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ فرع انسانی پر تمام حجت
 کرنا چاہتا تھا تاکہ آخری عدالت کے موقع پر کوئی گمراہ مجرم اُس کے سامنے یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ ہم ناواقف تھے اور

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّكُمْ فَآمِنُوا
خَيْرًا لَكُمْ وَإِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي
دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى
ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَى مَرْيَمَ

لوگو! یہ رسول تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق لے کر آیا ہے، ایمان لے آؤ،
تمہارے ہی لیے بہتر ہے، اور اگر انکار کرتے ہو تو جان لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب
اللہ کا ہے اور اللہ علیم بھی ہے اور حکیم بھی۔

اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح
عیسیٰ ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان تھا جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا

آپنے میں حقیقت حال سے آگاہ کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ اسی غرض کے لیے خدا نے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیغمبر
بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔ ان پیغمبروں نے کثیر تعداد انسانوں تک حقیقت کا علم پہنچایا اور اپنے پیچھے کتابیں چھوڑ گئے جن میں
کوئی نہ کوئی کتاب انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر زمانہ میں موجود رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے تو اس کا الزام
خدا پر اور اس کے پیغمبروں پر عائد نہیں ہوتا بلکہ یا تو خود اس شخص پر عائد ہوتا ہے کہ اس تک پیغام پہنچا اور اس نے قبول نہیں
کیا، یا ان لوگوں پر عائد ہوتا ہے جن کو راہ راست معلوم تھی اور انہوں نے خدا کے بندوں کو گمراہی میں مبتلا دیکھا تو انہیں
آگاہ نہ کیا۔

۲۰۹ یعنی زمین و آسمان کے مالک کی نافرمانی کر کے تم اس کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے، نقصان جو کچھ ہوگا
تمہارا اپنا ہوگا۔

۲۱۰ یعنی تمہارا خدا نہ تو بے خبر ہے کہ اس کی سلطنت میں رہتے ہوئے تم شرارتیں کرو اور اسے معلوم نہ ہو اور
نہ وہ نادان ہے کہ اسے اپنے فرامین کی خلاف ورزی کرنے والوں سے نمٹنے کا طریقہ نہ آتا ہو۔

۲۱۱ یہاں اہل کتاب سے مراد عیسائی ہیں اور غلو کے معنی ہیں کسی چیز کی تائید و حمایت میں حد سے گزر جانا۔ یہودیوں کا
جزم یہ تھا کہ وہ مسیح کے انکار اور مخالفت میں حد سے گزر گئے اور عیسائیوں کا جرم یہ ہے کہ وہ مسیح کی عقیدت اور محبت میں

وَرُوحٌ مِّنْهُ فَامْنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِۦ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ ۚ اِنْتَهُمُ

اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے (جس نے مریم کے رحم میں بچہ کی شکل اختیار کی) پس تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ "تین" ہیں۔ باز آ جاؤ، حد سے گزر گئے۔

۲۱۲ اصل میں لفظ "کلمہ" استعمال ہوا ہے۔ مریم کی طرف کلمہ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے حضرت مریم علیہا السلام کے رحم پر یہ فرمان نازل کیا کہ کسی مرد کے لفظ سے میرا بھوٹے بیٹے کی شکل کا استقرار قبول کرے عیسائیوں کو ابتدا میں مسیح علیہ السلام کی پیدائش ہے پیداکا ہی راز بتایا گیا تھا۔ مگر انہوں نے یونانی فلسفہ سے گمراہ ہو کر پہلے لفظ کلمہ کو "کلام" یا "لفظ" (Words) کا ہم معنی سمجھ لیا۔ پھر اس کلام و لفظ سے اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت کلام مراد لے لی۔ پھر یہ قیاس قائم کیا کہ اللہ کی اس ذاتی صفت نے مریم علیہا السلام کے بطن میں داخل ہو کر وہ جسمانی صورت اختیار کی جو مسیح کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس طرح عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا فاسد عقیدہ پیدا ہوا اور اس غلط تصور نے بڑھکڑی کر خدا سے خود اپنے آپ کو یا اپنی ازلی صفات میں سے لفظ و کلام کی صفت کو مسیح کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔

۲۱۳ یہاں خود مسیح کو رُوحٌ مِّنْهُ (خدا کی طرف سے ایک روح) کہا گیا ہے اور مژدہ بقرہ میں اس معنوں کو رو (د) کیا گیا ہے کہ اَیَّدْنَا لَهُ بُرُودِیْنِ الْقُدُسَ (ہم نے پاک روح سے مسیح کی مدد کی)۔ دونوں جہازوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسیح علیہ السلام کو وہ پاکیزہ روح عطا کی تھی جو ہدی سے نا آشنا تھی۔ سراسر حقانیت اور راست بازی تھی، اور از سر تپا فضیلت اخلاق تھی۔ یہی تعریف آنجناب کی عیسائیوں کو بتائی گئی تھی۔ مگر انہوں نے اس میں بھی غلو کیا، اُوْصَتْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَہِ کو رُوح اللہ قرار دے لیا، اور رُوح القدس (Holy Ghost) کا مطلب یہ لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اپنی رُوح مقدس تھی جو مسیح کے اندر طول کر گئی تھی۔ اس طرح اللہ اور مسیح کے ساتھ ایک تیسرا خدا رُوح القدس کو بنا ڈالا گیا۔ یہ عیسائیوں کا وہ سرائر بدست غلو تھا جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ نطفہ یہ ہے کہ آج بھی انجیل مٹی میں یہ فقرہ موجود ہے کہ "فرشتے نے اسے (یعنی یوسف بخاری) خواب میں دکھائی دے کر کہا کہ لمے یوسف ابن داؤد اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈرا کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ رُوح القدس کی قدرت سے ہے۔" (باب ۱-آیت ۲۰)

۲۱۴ یعنی اللہ کو واحد الہ مانو اور تمام رسولوں کی رسالت تسلیم کرو جن میں سے ایک رسول مسیح بھی ہیں۔ یہی مسیح علیہ السلام کی اصلی تعلیم تھی اور یہی امر حق ہے جسے ایک سچے پیرو مسیح کو ماننا چاہیے۔

۲۱۵ یعنی تین الہوں کے عقیدے کو چھوڑ دو خواہ وہ کسی شکل میں تمہارے اندر پایا جاتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائی بیک وقت توحید کو بھی مانتے ہیں اور تثلیث کو بھی۔ مسیح علیہ السلام کے مرتبہ اقرانی جو انجیل میں ملتے ہیں ان کی بنا پر کوئی عیسائی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا اس ایک ہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔ ان کے لیے یہ تسلیم



خَيْرًا لَّكُمْ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَهٌ وَاحِدٌ سُبْحَانَهُ أَنْ يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ وَلَكِنْ
لَهُ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿٢٢٩﴾

یہ تمہارے ہی لیے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔ وہ بالاتر ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔ زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں اس کی ملک ہیں اور ان کی کفالت و خبر گیری کے لیے بس وہی کافی ہے۔ ۷

کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ توحید اہل دین ہے۔ مگر وہ جو ایک غلط فہمی ابتداء میں ان کو پیش آگئی تھی کہ کلام اللہ نے مسیح کی شکل میں ظہور کیا اور روح اللہ نے اس میں حلول کیا اس کی وجہ سے انہوں نے مسیح اور روح القدس کی الوہیت کو بھی خداوند عالم کی الوہیت کے ساتھ ماننا خواہ مخواہ اپنے اوپر لازم کر لیا۔ اس زبردستی کے التزام سے ان کے لیے یہ مسئلہ ایک ناقابل حل جھڑپ بن گیا کہ عقیدہ توحید کے باوجود عقیدہ تثلیث کو اور عقیدہ تثلیث کے باوجود عقیدہ توحید کو کس طرح نبائیں۔ تقریباً ۱۸ سو برس سے مسیحی علماء اسی خود پیدا کردہ مشکل کو حل کرنے میں سرکھار رہے ہیں۔ بیسیوں فرقتے اسی کی مختلف تعبیرات پر بنے ہیں۔ اسی پر ایک گروہ نے دوسرے کی تنقیر کی ہے۔ اسی کے جھگڑوں میں یکساں پر یکساں الگ ہوتے چلے گئے۔ اسی پر ان کے سامنے علم کلام کا زور صرف ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ مشکل نہ خدا نے پیدا کی تھی نہ اس کے بھیجے ہوئے مسیح نے اور نہ اس مشکل کا کوئی حل ممکن ہے کہ خدائین بھی مانے جائیں اور پھر وحدانیت بھی برقرار رہے۔ اس مشکل کو صرف ان کے غلو نے پیدا کیا ہے اور اس کا بس یہی ایک حل ہے کہ وہ غلو سے باز جائیں مسیح اور روح القدس کی اکوہیت کا تخیل چھوڑ دیں صرف اللہ کو الٰہ واحد تسلیم کر لیں اور مسیح کو صرف اس کا پیغمبر قرار دیں نہ کہ کسی طور پر شریک فی الالٰہیت۔

۲۲۶ یہ عیسائیوں کے پورے غلو کی تردید ہے۔ بائبل کے مجدد جدید کی روایات اگر مسیح بھی ہوں تو ان سے (مختصر مآپلی تین انجیلوں سے) زیادہ سے زیادہ بس اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے خدا اور بندوں کے تعلق کو باپ اور اولاد کے تعلق سے تشبیہی تھی اور "باپ" کا لفظ خدا کے لیے وہ محض مجاز اور استعارہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ تنہا مسیح ہی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے بنی اسرائیل خدا کے لیے باپ کا لفظ برتتے چلے آ رہے تھے اور اس کی کثرت مثالیں بائبل کے پورے عہد نامہ میں موجود ہیں مسیح نے یہ لفظ اپنی قوم کے محاورے کے مطابق ہی استعمال کیا تھا اور وہ خدا کو صرف اپنا باپ ہی نہیں بلکہ سب انسانوں کا باپ کہتے تھے۔ لیکن عیسائیوں نے یہاں پھر غلو سے کام لیا اور مسیح کو خدا کا اکھوتا بیٹا قرار دیا۔ ان کا عجیب و غریب نظریہ اس باب میں یہ ہے کہ چونکہ مسیح خدا کا منکر ہے اور اس کے لئے اور اس کی روح کا جسدی ظہور ہے اس لیے وہ خدا کا اکھوتا بیٹا ہے اور خدا نے اپنے اکھوتے کو زمین پر اس لیے بھیجا کہ انسانوں کے گناہ اپنے سر لے کر صلیب پر چڑھ جائے اور اپنے خون سے انسان کے گناہ کا کفارہ ادا کرے۔ حالانکہ اس کا کوئی ثبوت خود مسیح علیہ السلام کے

لَنْ يَسْتَنْكِفَ السَّيِّئُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ
الْمُقَرَّبُونَ وَمَنْ يَسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ
فَسَيَحْشُرُهُمُ إِلَيْهِ جَمِيعًا ۝ فَاَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا
الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدُهُمْ مِنْ فَضْلِهِ
وَأَمَّا الَّذِينَ اسْتَنْكَفُوا وَاسْتَكْبَرُوا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا
أَلِيمًا ۝ وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا
نَصِيرًا ۝ يَأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ

مسیح نے کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھا کہ وہ اللہ کا ایک بندہ ہو، اور نہ مقرب ترین فرشتے
اس کو اپنے لیے عار سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لیے عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تو
ایک وقت آئے گا جب اللہ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرے گا۔ اُس وقت وہ لوگ جنہوں نے
ایمان لا کر نیک طرز عمل اختیار کیا ہے اپنے اجر پورے پورے پائیں گے اور اللہ اپنے فضل سے
ان کو مزید اجر عطا فرمائے گا، اور جن لوگوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا ہے اُن کو اللہ
دردناک سزا دے گا اور اللہ کے سوا جن جن کی سرپرستی و مددگاری پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں
ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے۔

لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس دلیل روشن آگئی ہے

کسی قول سے وہ نہیں دے سکتے۔ یہ عقیدہ ان کے اپنے خیالات کا آفریدہ ہے اور اُس غلو کا نتیجہ ہے جس میں وہ اپنے پیغمبر کی
عظیم الشان شخصیت سے متاثر ہو کر مبتلا ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں کفارہ کے عقیدے کی تردید نہیں کی ہے، کیونکہ عیسائیوں کے ہاں یہ کوئی مستقل عقیدہ نہیں ہے بلکہ
مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دینے کا شاخسانہ اور اس سوال کی ایک صوفیانہ و فلسفیانہ توجیہ ہے کہ جب مسیح خدا کا اکوڑا تھا تو وہ مہلیب
پر چڑھ کر لعنت کی موت کیوں مرا۔ لہذا اس عقیدے کی تردید آپ سے آپ ہو جاتی ہے اگر مسیح کے ابن اللہ ہونے کی تردید

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُبِينًا ۝ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ
وَأَعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۖ وَ
يَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝ يَسْتَفْتُونَكَ ۖ قُلِ اللَّهُ
يُفْتِيكُم فِي الْكَلَالَةِ ۖ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ
أُخْتُ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۖ وَهُوَ يَرِثُهَا إِن لَّمْ يَكُنْ

اور ہم نے تمہاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمہیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔
اب جو لوگ اللہ کی بات مان لیں گے اور اس کی پناہ ڈھونڈیں گے ان کو اللہ اپنی رحمت اور اپنے
فضل و کرم کے دامن میں لے لے گا اور اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ ان کو دکھا دے گا۔

لوگ تم سے کلالہ کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص بے اولاد
مر جائے اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے ترکہ میں سے نصف پائے گی اور اگر بہن بے اولاد مرے تو

کردی جائے اور اس غلط فہمی کو دور کر دیا جائے کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے گئے تھے۔

۲۱۷ یعنی زمین و آسمان کی موجودات میں سے کسی کے ساتھ بھی خدا کا تعلق باپ اور بیٹے کا نہیں ہے بلکہ محض
مالک اور ملوک کا تعلق ہے۔

۲۱۸ یعنی خدا اپنی خدائی کا انتظام کرنے کے لیے خود کافی ہے اس کو کسی سے مدد لینے کی حاجت نہیں کسی کو
اپنا بیٹا بنانے۔

۲۱۹ یہ آیت اس سورہ کے نزول سے بہت بعد نازل ہوئی ہے۔ بعض روایات سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ
یہ قرآن کی سب سے آخری آیت ہے۔ یہ بیان اگر صحیح نہ بھی ہو تب بھی کم از کم اتنا تو ثابت ہے کہ یہ آیت شہدہ ہجری میں نازل ہوئی۔
اور سورہ نساء اس سے بہت پہلے ایک مکمل سورہ کی حیثیت سے پڑھی جا رہی تھی۔ اسی وجہ سے اس آیت کو ان آیات کے سلسلہ
میں شامل نہیں کیا گیا جو احکام میراث کے متعلق سورہ کے آغاز میں ارشاد ہوئی ہیں، بلکہ اسے منیمہ کے طور پر آخر میں لگا دیا گیا۔

۲۲۰ کلالہ کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض کی رائے میں کلالہ وہ شخص ہے جو اولاد بھی ہو اور جس کے باپ اور
دادا بھی زندہ نہ ہوں۔ اور بعض کے نزدیک محض اولاد مرنے والے کو کلالہ کہا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آخر وقت تک
اس معاملہ میں متردد رہے۔ لیکن عامۃ فقہاء نے حضرت ابو بکر کی اس رائے کو تسلیم کر لیا ہے کہ اس کا اطلاق پہلی صورت پر ہی

لَهَا وَلَدٌ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الشُّلْثُ مِمَّا تَرَكَ وَ
 إِنْ كَانُوا إِخْوَةً رِجَالًا وَنِسَاءً فَلِلَّذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ
 يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَنْ تَضِلُّوا وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۱۸۶﴾

بھائی اس کا وارث ہوگا۔ اگر میت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکے میں سے دو تہائی کی مقدار
 ہوں گی اور اگر کئی بھائی بہنیں ہوں تو عورتوں کا اکہرا اور مردوں کا دوہرا حصہ ہوگا۔ اللہ تمہارے
 لیے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

ہوتا ہے۔ اور خود قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کیونکہ یہاں کلام کی بہن کو نصف ترکہ کا وارث قرار دیا گیا ہے حالانکہ
 اگر کلام کا باپ زندہ ہو تو بہن کو سرے سے کوئی حصہ پہنچتا ہی نہیں۔

۵۲۲۱ یہاں اُن بھائی بہنوں کی میراث کا ذکر ہو رہا ہے جو میت کے ساتھ ماں اور باپ دونوں میں یا صرف
 باپ میں مشترک ہوں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک خطبہ میں اس معنی کی تصریح کی تھی اور صحابہ میں سے کسی نے
 اس سے اختلاف نہ کیا، اس بنا پر یہ مجمع علیہ مسئلہ ہے۔

۵۲۲۲ یعنی بھائی اس کے پورے مال کا وارث ہوگا اگر کوئی اور صاحب فریضہ نہ ہو۔ اور اگر کوئی صاحب فریضہ
 موجود ہو، مثلاً شوہر، تو اس کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی تمام ترکہ بھائی کو ملے گا۔

۵۲۲۳ یہی حکم دو سے زائد بہنوں کا بھی ہے۔



Surah!